قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

اگست 1966

سچّے موتی

رسول اللہ (صلعم) نے فرمایا:

جس بستی میں کسی ایک فرد نے بھی اس حالت میں صبح کی کہ وہ رات بھر بھوکا رہا۔ اس بستی سے اللہ کی حفاظت و نگرانی کا ذمّہ ختم ہوا۔

(مسند امام احمد)

شائع کردہ

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

قیمت فی پرچہ : ایک روپیہ

ادارۂ طلوع اسلام کی انقلاب آفریں پیشکش

سلسبیل

قرآنی فکر کا چشمۂ رواں — قرآنی بصیرت کی جوئے شیر

یعنی

مفکر قرآن محترم پرویز صاحب کے انقلاب انگیز مضامین کا دوسرا مجموعہ

قرآن کریم کی حیات بخش تعلیم - پرویز کا حسین انداز بیان - اور

ادارہ کی پیشکش — تینوں یک جا -

کتابت طباعت دیدہ زیب - کاغذ وھائٹ پرنٹنگ - جلد عمدہ - گرد پوش جاذب نگاہ -

ضخامت — ساڑھے تین سو صفحات

قیمت — مجلد آٹھ روپے

ادارۂ طلوع اسلام ۲۵ - بی - گلبرگ - لاہور

قرآنی نظامِ ربوبیّت کا پیامبر

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

بدلِ اشتراک
پاک و ہند سے
سالانہ ——— دس روپے
غیر ممالک سے
سالانہ ——— ایک پونڈ

قیمت فی پرچہ
پاک و ہند سے
ایک روپیہ

ٹیلیفون ۸۰۸۰۰

خط و کتابت کا پتہ
ناظم ادارہ طلوعِ اسلام
۲۵۔بی گلبرگ لاہور

نمبر ۸	اگست ۱۹۶۶ء	جلد ۱۹

فہرست مضامین

(۱) لمعات ——— ۲
(۲) ناظرہ قرآن شریف اور اسلامیات ——— ۱۹
(۳) دین کی باتیں ——— (محترمہ ثریا عندلیب) ——— ۲۴
(۴) باب المراسلات ——— (ملت کا عزیز ترین سرمایہ ہماری نوخیز تعلیم یافتہ پود) ——— ۲۵
(۵) نقد و نظر ——— ۳۰
(۶) عمل ——— (محترم ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب) ——— ۳۳
(۷) اسلامی نظام ——— (محترم پرویز صاحب) ——— ۵۲
(۸) عورت ——— دو آئینوں میں ——— ۵۵
(۹) آرٹ اور اسلام ——— (محترم پرویز صاحب) ——— ۵۷
(۱۰) رابطۂ باہمی ——— ۷۸
(۱۱) کچھ کتابوں کی بابت ——— ۷۹۔۸۰

ایڈیٹر: صفدر سلیمی، ناشر: سراج الحق، مقامِ اشاعت ۲۵۔بی، گلبرگ لاہور۔ پرنٹر: شیخ محمد اشرف۔ مطبوعہ: اشرف پریس ایبک روڈ، لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

ہمارے علمائے کرام خود اپنے آئینے میں

آج دنیا کی ہر قوم مختلف قسم کی الجھنوں میں گرفتار ہے، اور اپنی اپنی جگہ ان کے حل کرنے کی کوششوں میں مصروف ـــ کہیں انفرادی طور پر، کہیں دوسری اقوام کے تعاون سے۔ لیکن پاکستان کی الجھن ان سب سے نرالی ہے اور اس نوعیت کی کہ نہ اس کا حل انفرادی طور پر ملتا ہے اور نہ ہی دنیا کی کوئی اور قوم اس معاملہ میں اس کی کوئی مدد کر سکتی ہے۔ یہ نہ سلجھنے والی الجھن ـــ یہ لاینحل مسئلہ یہ ہے کہ یہاں قوانین کس طرح سے مرتب کئے جائیں۔ اگر ہم دنیا کی کسی اور قوم کے سامنے اپنی اس دشواری کو بیان کریں، تو بات اس کی سمجھ میں ہی نہ آسکے۔ وہ لوگ ہم سے کہیں گے کہ آپ کے ہاں مملکت کا آئین موجود ہے۔ اس آئین میں قانون سازی کا طریق موجود ہے۔ آپ کا نظام جمہوری ہے، سسٹم صدارتی ہے۔ جمہوری نظام کی رُو سے ایک منتخب شدہ پارلیمان ہے۔ اس پر منتخب شدہ صدر بھی موجود ہے۔ پھر قانون سازی کے معاملہ میں آپ کی دشواری کیا ہے؟ ہم ان میں سے کسی بات سے بھی انکار نہیں کر سکتے۔ یہ سب کچھ ہمارے ہاں موجود ہے، اور ان کی موجودگی میں قانون سازی کے سلسلہ میں ذرا بھی دقت نہیں ہونی چاہیئے۔ لیکن اس کے باوجود ہمارے ہاں اس سلسلہ میں دقت ہے اور دقت بھی ایسی کہ (جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے) جو رفع ہی نہیں ہو سکتی۔ یہی وہ دِقّت ہے جس کی وجہ سے یہاں صورت یہ ہے کہ تشکیلِ پاکستان کو اٹھارہ برس ہونے کو آئے۔ ہمارا قانون سازی کا مسئلہ، بھنور میں پھنسی ہوئی لکڑی کی طرح ایک ہی مقام پر مصروفِ گردش ہے۔ وہ دقّت یہ ہے کہ۔

(۱) ایک طرف ہمارے ہاں جمہوری نظام رائج ہے جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ قوم کے نمائندگان پر مشتمل پارلیمان کا منظورہ کردہ قانون (صدر مملکت کی تصویب کے بعد) ملک کا قانون بن جاتا ہے۔
لیکن :-

(۲) دوسری طرف ہمارے آئین میں یہ شق رکھی گئی ہے کہ ملک کا کوئی قانون، کتاب وسنت کے خلاف نہیں ہوگا۔

شق دوم کے سلسلہ میں ہمارے علمائے کرام آگے بڑھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس بات کا فیصلہ ہم ہی کر سکتے ہیں کہ کون سا قانون کتاب وسنت کے مطابق ہے اور کون سا ان کے خلاف۔ اس لئے قانون سازی کے سلسلہ میں آخری فیصلہ ہمارا ہوگا، نہ کہ ملک کے جمہوری نظام کا۔

پھر تماشا یہ ہے کہ خود انہی حضرات کی ایک جماعت (جماعت اسلامی) ایک طرف جمہوریت کو عین اسلام قرار دیتی ہے اور دوسری طرف یہ شرط بھی عائد کرتی ہے کہ کتاب وسنت کے مطابق اسی قانون کو سمجھا جائے گا جس کے متعلق وہ فتوے دیں کہ وہ کتاب وسنت کے مطابق ہے۔

خود ہمارے ہاں آئین کی یہ کیفیت ہے کہ اس میں اس امر کی تو پوری تفصیل اور وضاحت موجود ہے کہ پارلیمان کس طرح قانون پاس کرے گی، صدر مملکت کس طرح اسے منظور یا نامنظور کرے گا۔ نامنظوری کی صورت میں کیا طریق کار اختیار کیا جائے گا۔ یعنے جس طرح جمہوری نظام میں مملکت کے قوانین مرتب ہوتے ہیں اس کی پوری تفصیل آئین میں موجود ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ شرط بھی رکھ دی گئی ہے کہ کوئی قانون کتاب وسنت کے خلاف نہیں ہوگا۔ اور یہ کہیں نہیں بتایا گیا کہ اس کا فیصلہ کس طرح کیا جائیگا کہ فلاں قانون کتاب وسنت کے خلاف ہے یا نہیں۔ یعنی جو شرط جمہوری اندازِ قانون سازی پر راکب (RIDER) ہے اس کا کوئی طریق کار آئین میں نہیں دیا گیا، نہ ہی یہ بتایا گیا ہے کہ اس سلسلہ میں قولِ فیصل کس کا ہوگا، یعنے یہ معلوم ہی نہیں کہ ہمارے ملک میں قانون سازی کے سلسلہ میں اقتدار اعلیٰ (SOVEREIGNITY) کسے حاصل ہے۔ ہماری مذہبی پیشوائیت آئین کے اس نقص سے فائدہ اٹھا رہی ہے اور اس امر کی مدعی ہے کہ یہ اقتدار اعلیٰ اسے حاصل ہے اور تماشا یہ کہ حکومت اس باب میں خاموش ہے۔ دوسری طرف (جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے) مذہبی پیشوائیت (جماعت اسلامی) ملک میں 'جمہوریت کی بحالی' کے لئے بھی صرف جہاد ہے اور اس کے ساتھ اس امر کی بھی مدعی کہ اس امر کا فیصلہ کرنا — کہ ملک میں کون سا قانون نافذ ہونا چاہیئے — یہ جماعت کرے گی۔ یعنی ملک میں اقتدار اعلیٰ جمہوریت کو نہیں بلکہ اس جماعت کو حاصل ہوگا۔

اور ملک میں کوئی شخص ایسا نہیں جو اس سوال کو لے کر اٹھے اور سوچے اور پوچھے کہ یہاں قانون مرتب کیسے ہوگا؟ اس لئے کہ

سب اپنے بنائے ہوئے زنداں میں ہیں محبوس

آپ سوچئے کہ کیا دنیا کی کسی قوم کے سامنے اس قسم کی کوئی الجھن ہے، اور اس الجھن کا کوئی حل ہمیں مل سکتا ہے؟ ہم اس وقت اس نکتہ پر بحث نہیں کرنا چاہتے کہ ہمارے نزدیک اس الجھن کا حل کیا ہے؟ (ہم اس حل کو مسلسل اٹھارہ برس سے پیش کرتے چلے آ رہے ہیں۔) ہم سردست یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ہمارے علماء کرام کا جو یہ دعوےٰ ہے کہ اس بات کا فیصلہ وہی کر سکتے ہیں کہ کون سا قانون کتاب و سنت کے مطابق ہے اور کون سا اس کے خلاف، اس دعوے کی حقیقت کیا ہے، اور کیا وہ واقعی اس قابل ہیں کہ ایسے اہم اور بنیادی معاملات کا فیصلہ کر سکیں؛

یہ حضرات اپنے اس دعوے کی تائید میں بالعموم اس قسم کے دلائل پیش کیا کرتے ہیں کہ ۔ جب آپ مکان بنانے کا ارادہ کرتے ہیں تو اس کی بابت کسی انجنیئر سے مشورہ کرتے ہیں۔ جب آپ نے کسی مقدمہ کے سلسلہ میں قانونی پوزیشن سمجھنی ہوتی ہے تو کسی وکیل کی طرف رجوع کرتے ہیں، جب آپ بیمار ہوتے ہیں تو کسی ڈاکٹر کے پاس جاتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ جب آپ نے مذہب کے متعلق کوئی بات پوچھنی ہو یا یہ دیکھنا ہو کہ فلاں قانون اسلام کے مطابق ہے یا اس کے خلاف، تو اس کے لئے آپ کو علمائے کرام کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔ اگر آپ یہ کام مستریوں کے سپرد کر دیں گے تو جو حشر آپ کا مکان بنوانے کے متعلق کسی اناڑی سے مشورہ لینے سے، بیماری کی صورت میں کسی عطائی کا علاج کرانے سے، یا مقدمہ کے سلسلے میں کسی منشی متعدی کی بات ماننے سے ہوگا، وہی حشر آپ کا اس شکل میں بھی ہوگا۔ لہٰذا اسلامی مملکت میں قانون سازی کا کام علماء ہی کے سپرد کرنا، اور انہی کے فیصلہ کو سند اور حجت تسلیم کرنا چاہیئے؛

یہ دلیل بظاہر بڑی وزنی نظر آتی ہے لیکن آیئے ہم دیکھیں کہ جن حضرات کو "علماء" کہا جاتا ہے ان کا مبلغ علم کیا ہوتا ہے اور کیا وہ واقعی اس قابل ہوتے ہیں کہ ایک مملکت کے قوانین کے سلسلہ میں ان کے فیصلہ کو حرفِ آخر سمجھا جائے۔ اس سلسلہ میں ہم اپنی طرف سے ایک لفظ بھی نہیں کہیں گے بلکہ ان حضرات کے اقوال و آراء پیش کریں گے جنہیں یہ (علماء) اپنے سے بھی بڑے، یا کم از کم اپنے پائے کے عالم قرار دیتے ہیں۔ غور سے سنیئے کہ ان حضرات کی، علمائے کرام کے علم اور کردار کے متعلق کیا آراء ہیں۔

اس وقت تمام عالمِ اسلام کے مذہبی دارالعلوموں میں جامعہ ازہر (مصر) کو بلند ترین مقام حاصل ہے

مفتی عبدہٗ کی رائے

اس یونیورسٹی کے علماء کے متعلق کسی منڈی کی نہیں، علامہ مفتی محمد عبدہٗ جیسی بلند پایہ شخصیت کا فیصلہ سنیئے جن کا ایک مدت تک خود اس یونیورسٹی کے بلند ترین ارکان میں شمار ہوتا تھا۔ وہ لکھتے ہیں:۔

جو شخص، ازہر یا اس قبیل کے مدارس میں جتنی زیادہ مدت تک تحصیلِ علم کرتا ہے اتنی ہی اس میں تحصیلِ علم کی صلاحیت مفقود ہوتی جاتی ہے۔ (تفسیر المنار۔ جلد اول ص۱۸)

ان کے شاگرد رشید، علامہ رشید رضا مرحوم، اپنے استاد کا یہ قول نقل کر کے لکھتے ہیں:۔

ان کا خیال تھا کہ علمائے ازہر اور ان کی قسم کے اور بڑے بڑے شیوخ و علماء وہ لوگ ہیں، جن کی اصلاح کی امید باقی نہیں رہی۔

یہ ہے مفتی عبدہٗ کی رائے ان علمائے اسلام کے متعلق جن سے بڑھ کر مذہب کے معاملات میں کوئی اور سند نہیں ہو سکتی۔

یہ تو رہا علماء ازہر کے علم کے متعلق۔ ان کا کردار کیا ہے، اس کے متعلق وہیں (مصر کے) ایک جید عالم، ڈاکٹر مصطفےٰ احمد زرقا فرماتے ہیں:۔

جامع ازہر کے فضلا نے ایسی کتابیں اور فتاوے شائع کئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنا قلم دشمنانِ اسلام کے ہاتھ گروی رکھ دیا ہے اور اسلام کی بنیادیں اس طرح ڈھا دینا چاہتے ہیں کہ جس طرح دشمن بھی نہیں ڈھا سکتے۔ اس قسم کے لوگوں کا دین سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ یہ تو منافق اور سازشی قسم کے لوگ ہیں جو اجتہاد اور آزادیٔ رائے اور حریتِ فکر کے پردے میں دین کے ساتھ خیانت اور مذاق کر رہے ہیں اور اس سازش اور خیانت کا ان کو بڑا معاوضہ مل رہا ہے اور خدا کی لعنت سے بے پروا ہو کر بڑے بڑے دنیوی منافع حاصل کر رہے ہیں۔

(معارف دسمبر ۱۹۶۰ء بحوالہ "مدینہ۔ بجنور" مورخہ ۲۰)

مصر سے نیچے اتر کر ہندوستان کی طرف آیئے تو یہاں مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) کی، علماء کی جماعت میں جو پوزیشن تھی اس سے یہ حضرات اچھی طرح واقف ہیں۔ وہ "امام الہند" کہلاتے تھے۔ مذہبی مکاتب اور دارالعلوموں میں جو کچھ پڑھ کر وہاں کے طالب العلم، سندِ فضیلت حاصل کرتے اور ایک مستند عالم قرار پاتے ہیں، اس کے متعلق وہ (مولانا آزاد) لکھتے ہیں:۔

مدتوں غور کرنے کے بعد یہ حقیقت کھلی کہ اُمتِ اسلامیہ کے تمام مفاسد و مصائب کی اصلی

جڑ وہی چیزیں ہیں جن کو یونانیت اور عجمیت سے تعبیر کرنا چاہیئے۔ سارے برگ و بار و ثمرات فساد کو انہی سے ظہور و نمود ہوا۔ آج ہمارے مدارس میں جو علوم باسمِ اصل و اساس علومِ شرعیہ پڑھے پڑھائے جاتے ہیں اگر کسی صاحبِ حکمت کی نظرِ کیمیاوی ان کی تحلیل و تفرید کرے تو کھل جائے کہ کس قدر حصہ ان کا شریعتِ اصلیہ اور دین الخالص سے مرکب ہے، کس قدر اس فتنۂ عالم آشوب، یونانیت وعجمیت سے۔ کوئی شے اس سے نہ بچی۔ حتٰے کہ علماً، علومِ الٰہیہ و بلاغت و بیان اور عملاً جزئیات اعمال و رسوم و ہیئاتِ معاشرت وغیرہ ذالک، جب یہ حال علومِ شرعیہ بلکہ نام نہاد اصولیہ کا ہے تو پھر ان اساطیر واوہام کا کیا پوچھنا، جن کو بہ لقبِ شریف "معقولات" پکارا جاتا ہے۔　(تذکرہ)

یہ ہیں وہ علوم جن کی تحصیل کے بعد ان مدارس اور دارالعلوموں میں "عالم" بن جانے کی سند ملتی ہے۔ اب ذرا ان درسگاہوں کا نصاب اٹھا کر دیکھیئے آپ کو نظر آ جائے گا کہ وہ نصابِ تعلیم نہیں، بلکہ چند قبریں ہیں جن میں سینکڑوں برس کی بوسیدہ اور متعفن ہڈیاں عقیدت وارادت کے کفن میں لپٹی ہوئی رکھی ہیں کوئی

ان کا نصابِ تعلیم

چند سال ادھر کا ذکر ہے، اسلامیہ کالج لاہور کے سابق لیکچرار حافظ نذر محمد صاحب نے اپنے ایک مبسوط مقالہ میں اس نصاب کی تفاصیل بیان کی تھیں جو ہمارے دارالعلوموں میں رائج ہے اور جسے عام طور پر "درسِ نظامی" کہا جاتا ہے۔ انہوں نے بتایا تھا کہ ان مدرسوں کا نصاب آٹھ سال ہے جس میں مندرجہ ذیل ۷ امضامین کی ۸۵ کتابیں پڑھائی جاتی ہیں:۔

	مضمون	کتب	قدیم ترین کتاب کا سن تالیف	جدید ترین کتاب کا سن تالیف
۱	صرف	۹	۱۴۱۳ء	۱۸۶۰ء
۲	نحو	۶	۱۳۲۳ء	۱۷۷۶ء
۳	معانی و بیان	۳		
۴	عروض	۱		
۵	منطق	۱۲	۱۲۶۱ء	۱۷۲۸ء
۶	فلسفہ	۳	۱۲۳۷ء	۱۶۵۱ء
۷	علمِ کلام	۴		
۸	ادبِ عربی	۷		
۹	سیرت و تاریخ	۲		

مضمون	کتب	قدیم ترین کتاب کا سن تالیف	جدید ترین کتاب کا سن تالیف
۱۰۔ طب	۴	۱۰۳۵ء	۱۷۵۵ء
۱۱۔ ہیئت	۲		
۱۲۔ ہندسہ	۱	۱۲۷۴ء	۱۴۷۴ء
۱۳۔ مناظرہ	۱		
۱۴۔ فقہ (اصول فقہ)	۱۳	۱۰۳۶ء	۱۷۵۵ء
۱۵۔ تفسیر (اصولِ تفسیر)	۴	۱۳۱۶ء	۱۵۰۵ء
۱۶۔ حدیث (اصولِ حدیث)	۱۱		
۱۷۔ تجوید و قرأت	۱۵		

یہ سترہ مضامین کی قریب ساڑھے اٹھارہ ہزار صفحات پر پھیلی ہوئی پچاسی کتابیں ہیں جنہیں رٹ لینے کے بعد ایک شخص مستند عالمِ دین بن جاتا ہے۔ آپ کو ان ۸۵ کتابوں میں قرآن کریم کا نام کہیں دکھائی نہیں دے گا۔ قرآن ان کے نصاب میں ہے ہی نہیں۔ صرف سورہ بقرہ آخری سال میں تبرکاً پڑھا دی جاتی ہے۔ اس سلسلہ میں حافظ ندیم محمد صاحب اپنے مقالہ میں لکھتے ہیں:۔

قرآن نصاب میں نہیں

یہاں ایک بنیادی سوال پیدا ہوتا ہے۔ اگر یہ تمام مضامین قرآن فہمی کے لئے پڑھائے جاتے ہیں تو پھر قرآن حکیم کب پڑھایا جاتا ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ چند مدارس کو چھوڑ کر کہیں بھی قرآن مجید کی مکمل تفسیر و تشریح کا انتظام نہیں۔ کتاب اللہ کے بغیر دینی تعلیم کی تکمیل کیونکر ہو جاتی ہے؟ بالیقین یہ کہا جا سکتا ہے کہ دورِ حاضر کے فتنوں کی بڑی وجہ یہ ہے کہ منبعِ علم و عرفان، کتاب اللہ سے غفلت برتی جا رہی ہے خواہ وہ یونیورسٹی اور کالج میں ہو یا مسجد اور مدرسہ میں۔

دنیاوی علوم سے بے بہرہ

یہ تو ہوا ان علمائے کرام کا مبلغ علم دین کے سرچشمہ اور قوانین اسلامیہ کے منبع، کتاب اللہ کے متعلق، جہاں تک دنیاوی علوم کا تعلق ہے، حافظ صاحب اس باب میں لکھتے ہیں:۔

دینی مدارس کے طلبا کا دنیا سے یکسر بے خبر ہونا حد درجہ افسوسناک ہے وہ اکثر مسائل حاضرہ کو نہ سمجھتے ہیں نہ ان کے حل پیش کر سکتے ہیں انہیں تحریکاتِ جدیدہ سے کوئی واقفیت نہیں

جدید تقاضوں نئے طرزِ فکر اور ضروریات کا انہیں کوئی علم نہیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ ان کے نصاب اور مشمولہ کتابوں کی قدامت ہے۔

اس قدامت پرستی کا نتیجہ کیا ہے؛ اسے صرف ایک واقعہ سے سمجھئے۔ اس وقت ہمارے سامنے بمبئی سے شائع ہونے والے اخبار ـــ انقلاب ـــ کا ۲۸ رجون ۱۹۶۶ء کا پرچہ ہے۔ اس میں حسب ذیل خبر ہمارے سامنے آتی ہے:

بیروت۔ ۱۷ رجون: سعودی عرب کے شہر مدینہ منورہ کی اسلامی یونیورسٹی کے صدر نے اعلان کیا ہے کہ زمین ایک جگہ قائم ہے اور سورج اس کے گرد چکر لگا رہا ہے۔ اگر کوئی شخص اس کے خلاف تصور کرے تو اسے پھانسی پر لٹکا دینا چاہیئے۔ سعودی عرب کے ایک اخبار میں گذشتہ دنوں صدر یونیورسٹی شیخ عبدالعزیز بن باز کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے کہا ہے کہ چاہے کتنی ہی تاخیر کیوں نہ ہو گئی ہو لیکن اب بھی اگر لوگوں کو صحیح راستے پر لایا جائے تو کوئی ہرج نہیں۔ بنی نوع انسان خود دیکھتے ہیں کہ زمین اپنی جگہ ساکت ہے اور سورج اس کے گرد گردش کر رہا ہے۔ طلوع ہوتا ہے اور پھر غروب ہوتا ہے۔ ... ... آپ نے مزید لکھا ہے کہ آج کے دعوے کے بموجب زمین اگر گردش کرتی ہوتی تو پھر شہر، درخت پہاڑ، دریا اور سمندروں میں استقامت نہ ہوتی۔ اگر زمین گردش کرنے لگے تو مشرق کے شہر مغرب میں اور مغرب کے شہر مشرق میں دیکھنے لگیں گے۔

یہ ہے مرکزِ اسلام، منبعِ علم، مدینہ منورہ کی یونیورسٹی کے صدر کی علمی سطح ـــ اس سے نیچے کے علماء حضرات کے مبلغِ علم کا اندازہ آپ خود لگا لیجئے؛ یا ان کے ہاں جو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں انہیں اٹھا کر دیکھ لیجئے ان مکتبوں اور دارالعلوموں میں علمی تحقیقات کا کیا عالم ہے، اس کے متعلق سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب (مغلوں کے زمانے میں ہندی مسلمانوں کے جائزہ کے سلسلے میں) لکھتے ہیں:

ذہنی جمود

اس کے بعد ذہنی حیثیت سے ہم تاریخ کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ کئی سالوں سے ہمارے ہاں علمی تحقیقات کا کام قریب قریب بند تھا۔ ہمارا سارا پڑھنا پڑھانا بس علومِ اوائل تک محدود تھا۔ ہمارے نظام تعلیم میں یہ تصور گہری جڑوں کے ساتھ جم گیا تھا کہ اسلاف جو کام کر گئے ہیں وہ علم و تحقیق کا حرفِ آخر ہے۔ اس پر کوئی اضافہ نہیں کیا جا سکتا۔ بڑی سے بڑی خدمت بس یہی ہو سکتی تھی کہ اگلوں کی لکھی ہوئی کتابوں پر شرحوں اور حاشیوں کے ردے چڑھائے جائیں۔ اس کی وجہ سے ایک مکمل جمود کی سی کیفیت ہماری ذہنی

فضا پر طاری ہو چکی ہے۔ (ترجمان القرآن - دسمبر ۱۹۵۱ء - جنوری ۱۹۵۲ء)

یہ ہے وہ ذہنی جمود جس کے پیکر ہمارے علمائے کرام ہوتے ہیں۔ (واضح رہے کہ مودودی صاحب نے جس وقت کا جائزہ اپنے تبصرہ میں لیا ہے، اس کے بعد بھی ہمارے ان دینی مدرسوں میں کسی قسم کا کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوا۔ تغیر و تبدل تو ان کی شریعت کی رُو سے بدعت ہے اور ہر بدعت انسان کو جہنم میں لے جاتی ہے)

یہی مودودی صاحب، خود اپنے زمانے کے "علماء کرام" کے متعلق لکھتے ہیں :-

علماء کی عام حالت یہ ہے کہ وہ زمانے کے موجودہ رجحانات اور ذہنیتوں کی نئی ساخت کو سمجھنے کی قطعاً کوشش نہیں کرتے۔ جو چیزیں مسلمانوں کی نئی نسلوں کو اسلام سے بیگانہ کر رہی ہیں ان پر اظہار نفرت تو ان سے جتنا چاہیئے کرا لیجئے لیکن اس زہر کا تریاق بہم پہنچانے کی زحمت وہ نہیں اٹھا سکتے۔ جدید حالات نے مسلمانوں کے لئے جو پیچیدہ علمی اور عملی مسائل پیدا کر دیئے ہیں، ان کو حل کرنے میں ان حضرات کو ہمیشہ ناکامی ہوتی ہے، اس لئے کہ ان مسائل کا حل اجتہاد کے بغیر ممکن نہیں۔ اور اجتہاد کو یہ اپنے اوپر حرام کر چکے ہیں۔ اسلام کی تعلیمات اور اس کے قوانین کو بیان کرنے کا جو طریقہ آج ہمارے علماء اختیار کر رہے ہیں وہ جدید تعلیم یافتہ لوگوں کو اسلام سے مانوس کرنے کے بجائے الٹا متنفر کر دیتا ہے اور بسا اوقات ان کے مواعظ سُن کر اور ان کی تحریروں کو پڑھ کر بے اختیار دل سے یہ دعا نکلتی ہے کہ — "خدا کرے کسی غیر مسلم یا بھٹکے ہوئے مسلمان کے چشم و گوش تک یہ صدائے بے ہنگام نہ پہنچی ہو۔"

(تنقیحات - ص ۲۵۸)

ترکوں کی حالت

انیسویں صدی میں ترکی کی حالت جس قدر خستہ و خراب ہو چکی تھی، اس میں علمائے کرام کا کس قدر حصہ تھا اس کے متعلق مودودی صاحب اپنی اسی کتاب میں لکھتے ہیں :-

انیسویں صدی کے آغاز میں سلطان سلیم نے اس کمزوری کو محسوس کیا اور انتظام سلطنت کی اصلاح، علوم جدیدہ کی اشاعت، طرز جدید پر عسکری تنظیم اور جدید مغربی آلات حرب کی ترویج شروع کی لیکن جاہل صوفیوں اور تنگ نظر علماء نے جو دین کے علم اور اس کی روح سے قطعاً بے بہرہ تھے، مذہب کے نام پر اصلاحات کی مخالفت کی۔ یورپین طرز پر فوج کی تنظیم کو بے دینی سے تعبیر کیا۔ جدید فوجی وردیوں کو تشبہ بالنصاریٰ قرار دیا۔ سنگین تک کے استعمال کی اس لئے مخالفت کی گئی کہ کافروں کے اسلحہ کو استعمال کرنا، ان کے نزدیک گناہ تھا۔ سلیم

کے خلاف یہ کہہ کر نفرت پھیلائی گئی کہ وہ کفار کے طریقے رائج کر کے اسلام کو خراب کر رہا ہے۔ شیخ الاسلام عطاء اللہ آفندی نے فتویٰ دیا کہ ایسا بادشاہ جو قرآن کے خلاف عمل کرتا ہو، بادشاہی کے لائق نہیں۔ آخر کار ۱۸۰۷ء میں سلیم کو معزول کر دیا گیا۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ مذہبی پیشواؤں نے اپنی جہالت اور تاریک خیالی سے اسلام کے مانع ترقی ہونے کا غلط تخیل پیش کیا۔ زمانے کے حالات تیزی کے ساتھ بدل رہے تھے۔ دوسرے مسلمانوں کی بہ نسبت ترکوں پر ان تغیرات کا زیادہ اثر پڑ رہا تھا۔ وہ یورپ کے مقابلہ میں سینہ بسینہ کھڑے تھے اور برسرپیکار تھے۔ مغربی قوموں کے ساتھ ان کے سیاسی، تمدنی اور تجارتی تعلقات نہایت گہرے تھے اور خود ان کی ماتحت یوروپین اور عیسائی قومیں سرعت کے ساتھ مغرب کے اثرات قبول کر رہی تھیں۔ مگر ترکوں کے مذہبی پیشواؤں نے جو تفقہ اور اجتہاد سے بالکل عاری اور اسلام کی حقیقی تعلیمات سے قطعاً ناواقف تھے ان تغیرات کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں اور ترکی قوم کو مجبور کیا کہ سات سو برس قبل کی فضا سے ایک قدم آگے نہ بڑھیں۔ سلیم کے بعد محمود نے اصلاح کی کوششیں کیں اور علماء و مشائخ نے پھر مخالفت کی۔ بڑی مشکلات کا مقابلہ کرنے کے بعد ۱۸۲۶ء میں محمود اس قابل ہو سکا کہ جدید عسکری تنظیم کو رائج کر سکے۔ مگر علماء اور درویش برابر یہی تبلیغ کرتے رہے کہ یہ اصلاحات بدعت ہیں، ان سے اسلام کو خراب کیا جا رہا ہے۔ سلطان بے دین ہو گیا ہے اور طرز جدید کی فوج میں بھرتی ہونا مسلمانوں کے لئے خرابیٔ ایمان کا موجب ہے۔ (ایضاً صفحہ ۶۶-۶۷)

علماء کی کوتاہ نگہی

جب ترکوں میں اپنی حالت بدلنے کے لئے انقلابی روح بیدار ہوئی تو اسے کچلنے کے لئے علمائے کرام کس قسم کی تعلیم پیش کر رہے تھے۔ اس کے متعلق مودودی صاحب لکھتے ہیں:۔

ایک طرف ترکی قوم میں اتنے بڑے انقلاب کی ابتداء ہو رہی تھی، دوسری طرف ترکوں کے علماء اور مشائخ تھے جو اب بھی سائویں صدی کی فضا سے نکلنے پر آمادہ نہ تھے۔ ان کے جمود، انکی تاریک خیالی، ان کی رجعت پسندی، اور زمانہ کے ساتھ حرکت کرنے سے ان کے قطعی انکار کا اب بھی وہی حال تھا جو سلطان سلیم کے زمانہ میں تھا وہ اب بھی کہہ رہے تھے کہ چوتھی صدی کے بعد اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا ہے، حالانکہ اُن کی آنکھوں کے سامنے الحاد کا دروازہ کھل رہا تھا۔ وہ ابھی تک فلسفہ کلام کی وہی کتابیں پڑھنے پڑھانے میں مشغول تھے جن کو پھینک کر

زمانہ پانچسو برس آگے پہنچ چکا تھا۔ وہ اب بھی اپنے وعظوں میں قرآن کی وہی تفسیریں اور وہی حدیثیں سنا رہے تھے، جن کو سن کر سو برس پہلے تک کے لوگ تو سر دُھنتے تھے مگر آج کل کے دماغ ان کو سُن کر صرف ان مفسرین و محدثین ہی سے نہیں بلکہ خود قرآن و حدیث سے بھی منحرف ہو جاتے ہیں۔ وہ ابھی تک اصرار کر رہے تھے کہ ترکی قوم میں وہی فقہی قوانین نافذ کئے جائیں گے جو شامی اور کنز الدقائق میں لکھے ہوئے ہیں۔ خواہ اس اصرار کا نتیجہ یہی کیوں نہ ہو کہ ترک ان قوانین کے اتباع سے بھی آزاد ہو جائیں جو قرآن اور سنتِ رسولؐ میں مقرر کئے گئے ہیں۔

(ایضاً۔ صفحہ)

حالات کے اس تفصیلی جائزہ کے بعد مودودی صاحب لکھتے ہیں:۔

ترکی تاریخ کے ان تحولات سے جو لوگ واقف نہیں ہیں وہ عجیب عجیب غلطیوں کا شکار ہو رہے ہیں۔ پرانے مذہبی خیال کے لوگ، نوجوان ترکوں پر کفر اور فسق کے فتوے لگا رہے ہیں مگر ان کو خبر نہیں کہ نوجوان ترکوں سے زیادہ گنہگار تو ترکی کے علماء و مشائخ ہیں۔ انہی کے جمود نے ایک مجاہد قوم کو جو پانچسو برس سے اسلام کے لئے تن تنہا سینہ سپر تھی۔ اسلامیت سے فرنگیت کی طرف ڈھکیلا ہے اور اندیشہ ہے کہ ایسے ہی جامدین دوسری مسلمان قوموں کو بھی ایک روز اسی جانب ڈھکیل کر رہیں گے۔ (ایضاً۔ صفحہ)

اب یہی مودودی صاحب یہاں، دن رات پکار رہے ہیں کہ حکومت کی باگ ڈور علمائے کرام کے ہاتھ میں دیدو۔ قانون سازی کے اختیارات انہی کے سپرد کر دو۔ ہر معاملہ میں ان کے قول کو قولِ فیصل قرار دو۔ کیا اس کا مطلب صاف یہی نہیں کہ مودودی صاحب پاکستان کو بھی اسی تباہی کے گڑھے میں دھکیل دینے کے درپئے ہیں جس میں ترکی کے علماء نے ترکی کو دھکیل دیا تھا؟ واضح رہے کہ ترکی کے علماء اور پاکستان کے علماء میں رتی برابر کا بھی فرق نہیں جتنی خرابیاں ترکی علماء میں مودودی صاحب نے گنائی ہیں وہ سب پاکستانی علماء میں موجود ہیں اور مودودی صاحب خود اس کے معترف ہیں۔ غور سے سنیئے! وہ اپنی کتاب تفہیمات (حصہ دوم) میں ان علمائے کرام کے متعلق رقمطراز ہیں:۔

باستثنائے[1] چند، اس طبقے کے سوادِ اعظم کا جو حال ہے اسے بیان کرنا گویا اپنی ٹانگ کھولنا، اور آپ ہی لاجوں مرنا ہے۔ ان حضرات کو اگر آپ نے عام فہم زبان میں من مانے خطبے دینے۔

[1] ہر مولوی اپنے اور اپنے ہم نواؤں کے لیے اس قسم کی گنجائش رکھ لیتا ہے۔

کا موقع دیا تو یقین جانیئے کہ آئے دن مسجدوں میں سر پھٹول ہوگی، اس لئے کہ ان میں کا ہر شخص اپنا ایک الگ مشرب رکھتا ہے اور اپنے مشرب میں وہ اتنا سخت ہے کہ دوسرے مشرب والوں کے ساتھ کسی قسم کی رعایت کرنا اس کے نزدیک گناہ سے کم نہیں۔ پھر اللہ نے اس کی زبان میں ایک ڈنک رکھ دیا ہے جس سے دلوں کو زخمی کئے بغیر وہ کوئی بات نہیں کر سکتا۔ وہ جس ماحول سے تعلیم و تربیت پاکر آتا ہے اور جس ماحول میں زندگی بسر کرتا ہے وہاں دین کے مہمات اور قوم کے مصالح کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ تمام دلچسپیاں سمٹ کر چند چھوٹی چھوٹی نزاعی باتوں میں جمع ہو گئی ہیں، اس لئے لامحالہ جب وہ زبان کھولے گا انہی مسائل پر کھولے گا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ کے گھر میں کالم گلوچ اور جوتی پیزار ہوگی اور آخر کار ہر مشرب کے مسلمان اپنے جمعے الگ الگ قائم کرنے لگیں گے۔ یہ تو مذہبی ذہنیت رکھنے والوں کا حال ہوا۔ رہے نئے تعلیم یافتہ حضرات جو ان مسائل سے دلچسپی نہیں رکھتے تو ان پر ایک دوسری مصیبت نازل ہوگی۔ وہ ہر جمعہ کو رسول اللہؐ کے منبر پر سے وہ وہ موضوع اور ضعیف روایتیں اور لاطائل کہانیاں اور احکام اسلامی کی غلط تعبیریں سنیں گے کہ جن کو سنکر غیر مسلموں کا مسلمان ہونا تو درکنار، ذی ہوش مسلمانوں کا مسلمان رہنا بھی مشکل ہے۔

مذہبی دھڑے بندیوں کے علاوہ اب مسلمانوں میں سیاسی دھڑے بندیوں کا بھی زور ہو رہا ہے۔ جہاں کہیں مولوی قسم کے مسٹروں، یا مسٹر قسم کے مولویوں کو امامت و خطابت کا موقع مل گیا ہے وہ وہاں نہایت منہ پھٹ اور بے لگام طریقے سے اپنے سیاسی مسلک کی تائید اور مسلکِ مخالف کے لوگوں کی تذلیل و تضحیک و تفسیق کرنے لگ گئے ہیں۔ یہ ایک اور فتنہ ہے جو اگر کچھ زیادہ بڑھ گیا تو مسلمانوں کے لئے ملکر نماز پڑھنا بھی مشکل ہو جائے گا۔ مسجدوں میں وہ کچھ ہونے لگے گا جو پولنگ اسٹیشنوں پر ہوا کرتا ہے اور بالآخر ہر سیاسی مسلک کے لوگوں کی مسجدیں الگ ہو کر رہیں گی۔

یہی بات مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) ان سے بہت پہلے ان الفاظ میں کہہ چکے ہیں کہ

تفرقہ بازی ان کا سرمایۂ ناز علم حق نہیں ہے جو تفرقہ مٹاتا اور اتباعِ سبل متفرقہ کی جگہ ایک ہی جگہ صراطِ مستقیم پر چلاتا ہے بلکہ یکسر جدل و خلاف ہے۔ نفس پرستی اس کی کثافت کو خمیر کر دیتی ہے اور دنیا طلبی کی آگ اس کی ناپاکی کے بخارات کو اور تیز کرتی رہتی ہے۔ (تذکرہ)

مسلمانوں کی تاریخ کا سب سے بڑا حادثہ، بغداد کی تباہی ہے۔ اس کے متعلق مولانا آزاد لکھتے ہیں :-

تاتاریوں کو سب سے پہلے دعوت حنفیوں اور شافعیوں کے باہمی پیکار نے دی تھی۔ نومسلم حکمران مذہبی علم سے ناآشنا تھے اس لئے مذہبی حکومت تمام تر علماء و فقہائے مذاہب کے ہاتھ آگئی۔ ہر مذہب کے الگ الگ قاضی، الگ الگ مدارس، اوقاف، ائمہ، جمعہ، اور مذہبی عہدے قرار پا گئے۔ یہی چیز صدہا مفاسد و مصائب کا باعث ہوئی۔ ایک طرف علمائے دنیا و فقہائے دولت کا ایک گروہِ عظیم پیدا ہو گیا، دوسری طرف باہمی تعصب و تفرقہ الگ روز بروز بڑھنے لگے حتیٰ کہ جن چھوٹے چھوٹے اختلافات کو پہلے عوام نے بھی کبھی اہمیت نہ دی تھی ان کی بنا پر اب خواص و فقہا ایک دوسرے کی تضلیل کرنے لگے۔ (تذکرہ)

بغداد کی تباہی

ہم پوچھتے ہیں ان حضرات سے جو مطالبہ کرتے ہیں کہ پاکستان میں قانون سازی کے اختیارات علماء کے ہاتھ میں دے دیئے جائیں، کہ کیا وہ یہاں بھی اس قسم کی تباہی لانا چاہتے ہیں جس قسم کی تباہی بغداد پر آئی تھی؟ یہاں کے علماء کے متعلق مولانا آزاد آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

علماء کا کردار

آج امت کا ایک فاسق سے فاسق گروہ بھی شاید کسی سچائی کی خاطر کچھ نقصانِ جان و مال اٹھا لے اور اس کو اپنے گناہوں کا کفارہ سمجھے لیکن مدعیانِ علم و مشیخت اور زہد فروشانِ سجادۂ طریقت سے اتنی بھی امید نہیں۔ گذشتہ دور میں جو بلائیں ہمارے سروں پر آئیں، اسی جماعت کی بدبختی اور نحوست کی راہ سے آئیں۔ بادشاہوں کو یہی لوگ راہِ راست سے ہٹا کر گمراہ کرتے تھے، بہتر طریقے جو گمراہی کے طریقے ہیں، جن لوگوں نے بھی اختیار کئے، انہی لوگوں کی بدولت۔ (تذکرہ)

علمائے کرام کے متعلق یہ کوئی مسٹر نہیں کہہ رہا، خود انہی حضرات کا ایک جلیل القدر نمائندہ کہہ رہا ہے۔ اسی کی زبان سے کچھ اور بھی سنیئے۔ وہ (مولانا آزاد) لکھتے ہیں:۔

سانپ اور بھیڑیا ایک سوراخ میں جمع ہو جائیں گے لیکن علمائے دنیا پرست کبھی یک جا اکٹھے نہ ہوں گے۔ کتوں کا جمع ویسے تو خاموش رہتا ہے، لیکن ادھر قصائی نے ہڈی پھینکی اور ادھر ان کے پنجے تیز اور دانت زہر آلود ہو گئے۔ یہی حال اِن سگانِ دنیا کا ہے۔ ساری باتوں میں متفق ہو سکتے ہیں لیکن دنیا کی ہڈی جہاں جہاں سڑ رہی ہو وہاں پہنچ کر اپنے پنجوں اور دانتوں پر قابو نہیں رکھ سکتے۔ فساق و فجار خرابات میں بھائیوں کی طرح ایک دوسرے کا جامِ تندرستی پیتے ہیں اور چور ڈاکو مل جل کر راہزنی کرتے ہیں۔ مگر یہ گروہ خدا کی مسجد اور زہد و عبادت کے صومعہ و خانقاہ میں بیٹھ کر بھی متحد و یک دل نہیں ہو سکتا۔ اور ہمیشہ ایک دوسرے کو درندوں کی طرح

چیرتا پھاڑتا اور پنجے مارتا ہے ۔میکدوں میں محبت کے ترانے اور پیار و الفت کی باتیں سننے میں آجاتی ہیں۔ مگر عین محراب کے نیچے پیشوائی امامت کے لئے ان میں سے ہر ایک کا ہاتھ دوسرے کی گردن پر بڑھتا اور خونخواری کی ہر آنکھ دوسرے بھائی کے خون پر لگی ہوتی ہے ۔ حضرت مسیحؑ نے احبار یہود سے فرمایا تھا کہ "تم نے داؤد کے گھروں کو ڈاکوؤں کا بھٹ بنا دیا ہے" ڈاکوؤں کے بھٹ کا حال تو معلوم نہیں، لیکن ہم نے مسجد کے صحن میں بھیڑیوں کو ایک دوسرے پر غراتے اور خون آشام دانت مارتے دیکھا ہے۔ (تذکرہ صفحہ ۸۲-۸۳)

اس کی تائید مودودی صاحب ان الفاظ میں کرتے ہیں ۔

پھر جو لوگ مسلمانوں کی راہ نمائی کے لئے اٹھتے ہیں، ان کی زندگی میں محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی ادنیٰ جھلک تک نظر نہیں آتی ۔ کہیں مکمل فرنگیت ہے، کہیں نہرو اور گاندھی کا اتباع ہے، کہیں جبّوں اور عماموں میں سیاہ دل اور گندے اخلاق لپٹے ہوئے ہیں ۔ زبان سے وعظ اور عمل میں بدکاریاں ، ظاہر میں خدمتِ دین، باطن میں خیانتیں ، غداریاں ، نفسانی اغراض کی بندگیاں ۔ (سیاسی کشمکش حصہ اول صفحہ ۵۵ بحوالہ جماعت اسلامی کا مخفی کردار صفحہ ۲۶۲) ۔

ان کی باہمی تکفیر کا یہ عالم ہے کہ ان کا کوئی فرقہ ایسا نہیں جس پر کفر کا فتوےٰ نہ لگ چکا ہو ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان میں سے کوئی ایک فرد بھی ایسا نہیں جسے کافر قرار نہ دیا گیا ہو ۔ اہل سنت والجماعت میں، حنفی اور اہلحدیث دو ممتاز فرقے ہیں ۔ ان کی باہمی تفسیق و تکفیر کے سلسلہ میں، جماعت اہل حدیث کے ترجمان

الاعتصام نے اپنی ۱۳ دسمبر ۱۹۶۳ کی اشاعت میں لکھا ہے :۔

یہ تو ایک اصل کی ایک جزی کو نہایت اختصار سے نقل کیا گیا ہے ۔ اگر اس پر اور دیگر سینکڑوں اصول جو نصوص اور ائمہ اہل حدیث کی تردید کے لئے وضع کئے گئے ہیں ۔ بحث و تمحیص کے لئے قلم کو اجازت دی جاتی تو ایک مبسوط کتاب مرتب ہو جاتی ۔ وہ کون سا بزرگ ہے جس نے حنفیت کے کسی مسئلہ سے اختلاف کیا ہو اور پھر اس کو خارج از اسلام کرنے کے لئے اصول نہ وضع کئے گئے ہوں ۔ اصول سے ہٹ کر ویسے بھی احناف کرام کی ائمہ اہل حدیث کے متعلق گفتگو اس قسم کی ہوتی ہے جس کا نمونہ آپ فاضلِ دیوبند کی کلام میں ملاحظہ فرما چکے ہیں ۔ ہم اگر ان کے بزرگوں کے وہ اقوال اور ملفوظات جو اہلِ حدیث کی تحقیر و تنقیص میں ان کی کتابوں میں موجود ہیں پیش ہی کریں تو غالباً اس کو بھی ہماری کم ظرفی اور چھچھورے پن پر محمول کریں گے ۔

(الاعتصام ۔ ۱۳ دسمبر ۶۳ء صفحہ ۱۲)

اور یہ تکفیر و تفسیق کس قسم کے مسائل کے سلسلہ میں ہوتی ہے، اس کے متعلق مودودی صاحب سے سنیئے وہ لکھتے ہیں کہ یہ حضرات اس قسم کے مباحثوں اور مناظروں میں سرگرم نظر آئیں گے۔ کہ

> رسول اللہ کو علم غیب تھا یا نہیں۔ خدا جھوٹ بول سکتا ہے یا نہیں۔ رسول کا نظیر ممکن ہے یا نہیں، ایصالِ ثواب اور زیارتِ قبور کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ آمین بالجہر یا رفع الیدین کیا جائے یا نہیں۔ مسجد میں محراب و منبر کے درمیان کتنا فاصلہ رکھا جائے۔
>
> (تنقیحات صفحہ ۵)

قانون سازی کے سلسلہ میں ایک بات تو واضح ہے۔ پاکستان ایک مملکت ہے اور ظاہر ہے کہ اس مملکت میں (کم از کم مسلمانوں کے لئے) ایک ہی قانون ہوگا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ یہ علماء کرام کسی ایک قانون کے متعلق بھی سب کے سب متفق ہو جائیں؟ جن لوگوں کی یہ حالت ہے کہ یہ تیرہ سو برس میں کتاب و سنت کی رو سے یہ طے نہیں کر سکے کہ نماز میں ہاتھ باندھنے چاہئیں یا کھلے چھوڑنے چاہئیں۔ اور اگر باندھنے چاہئیں تو کس مقام پر؟ نماز میں امام کے پیچھے الحمد پڑھنی چاہیئے یا نہیں۔ کیا وہ پاکستان کے لئے ایک ایسا ضابطہ قوانین مرتب کر سکیں گے جس پر ان سب کا اتفاق ہو؟ ضابطہ قوانین تو بڑی چیز ہے، ان کی کیفیت یہ ہے کہ ہر سال عید الفطر کے موقع پر آپ کو اخبارات میں اس قسم کے اعلانات دکھائی دیں گے۔

> فطرہ نماز عید الفطر سے پہلے ادا کرنا چاہیئے۔ فطرے کی رقم اہل سنت والجماعت کے عقیدے کے مطابق سوا دو سیر گندم کی قیمت کے برابر ہونی چاہیئے جس کا اندازہ ایک روپیہ ۲۵ پیسے لگایا گیا ہے۔ اہل حدیث حضرات کے عقیدے کے مطابق پونے تین سیر گندم کی قیمت کے برابر فطرہ ادا کرنا چاہیئے۔ رقم کے متعلق اہل حدیث علماء نے یہ مشورہ دیا ہے، کہ جس قیمت پر گندم آپ خرید کرتے ہیں، اسی حساب سے پونے تین سیر گندم کی قیمت ادا کریں۔ ناظم جمعیت اہلحدیث مولانا ابوبکر غزنوی نے مشورہ دیا ہے کہ احتیاطاً ڈیڑھ روپیہ فی کس ادا کیا جائے۔ شیعہ علماء نے فطرے کی رقم دو روپے مقرر کی ہے۔

پچھلے سال کی بات ہے کہ کسی صاحب نے ان سے یہ دریافت کیا کہ مشین سے ذبح کردہ جانور کا گوشت کھانا ازروئے شریعت جائز ہے یا ناجائز؟ اس استفتار کا جواب ایک تو مفتی محمد شفیع صاحب نے دیا اور دوسرا مفتی محمود صاحب نے۔ واضح رہے کہ یہ دونوں حضرات حنفی دیوبندی ہیں اور علماء میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ مفتی صاحب نے اپنے جواب میں فرمایا:

(۱) اگر مشین کی چھری گردن پر رکھنے والے نے بِسْمِ اللہِ کہہ کر چھری رکھی ہے، تو گو غیر مشروع طریقے سے ذبح کرنے کا گناہ ہوا، مگر گوشت حلال ہوگا ـــــ اور

(۲) مشینی ذبح کے عمل میں صرف وہ جانور حلال سمجھے جائیں گے جن پر چھری بیک وقت پڑے بشرطیکہ مشین کی چھری چلاتے وقت بسم اللہ پڑھ لی گئی ہو۔

اس کے برعکس ـــــ مفتی محمود صاحب نے یہ فتویٰ دیا کہ :-

بٹن دبانے والا مسلمان بھی ہو اور بٹن دباتے وقت تسمیہ بھی پڑھے، تب بھی مشین کے مروجہ ذبیحہ کو حلال نہیں کہا جا سکتا بلکہ وہ مردار ہی ہے۔

یعنی ایک ہی مسلک اور ایک ہی مکتبِ فکر کے دو عالم ایک دوسرے کے خلاف فتویٰ دے رہے ہیں ایک اُس گوشت کو حلال بتاتا ہے اور دوسرا اُسے حرام ٹھہراتا ہے۔ فرمائیے! ان میں سے کس کا فیصلہ اسلامی قانون کہلائیگا۔ (بحوالہ فکر و نظر - بابت ستمبر ۱۹۶۵ء)

ان حضرات کے یہ اختلافات کچھ ڈھکے چھپے نہیں۔ لیکن ان اختلافات کے باوجود ایک بات ایسی بھی ہے جو ان سب میں بطور قدرِ مشترک پائی جاتی ہے۔ وہ بات کیا ہے؟ اسے مودودی صاحب کی زبان سے سنیئے۔ وہ فرماتے ہیں کہ :

اَن پڑھ عوام ہوں یا دستار بند علماء، یا خرقہ پوش مشائخ یا کالجوں اور یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتہ حضرات! ان سب کے خیالات اور طور طریقے ایک دوسرے سے بدرجہا مختلف ہیں مگر اسلام کی حقیقت اور اس کی روح سے ناواقف ہونے میں سب یکساں ہیں۔

(تفہیمات حصہ اول - صفحہ ۳۸)

"اسلام کی حقیقت اور اس کی روح سے ناواقفیت" کی یہ سند، ان تمام حضرات کو جو علماء کہلاتے ہیں، خود انہی میں ایک صاحب کے ہاں سے مل رہی ہے (اور جو کچھ یہ صاحب دوسروں کے متعلق کہتے ہیں، دوسرے بھی کچھ ان کے متعلق کہتے ہیں)، اس کے بعد آپ سوچئے کہ ان حضرات کا یہ مطالبہ کہ چونکہ ہم اسلام کا صحیح علم رکھتے ہیں اس لئے یہ ہم سے پوچھئے کہ فلاں قانون اسلام کے مطابق ہے، یا اس کے خلاف، کس حد تک واجب الاعتنا قرار پا سکتا ہے؛

اسلام کی حقیقت تو بڑی چیز ہے، ان حضرات کی عام عقل کی کیفیت یہ ہے کہ یہ اس قسم کے تصوف کو بڑے فخر سے اور عالمانہ تبختر کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ (مثلاً)

ایسا ہی ایک قصہ عوام بن جوشب سے مروی ہے۔ وہ کہتے ہیں: میں ایک مرتبہ ایک قبیلہ کے

ہاں مہمان ٹھہرا۔ اس کے قریب ہی ایک قبرستان تھا، میں نے دیکھا اس قبرستان کی ایک قبر سے عصر کے بعد روزانہ ایک مردہ نکلتا ہے جس کا سر گدھے کا اور بدن انسان جیسا ہے گدھے کی سی تین آوازیں نکالتا پھر قبر میں جاکر محبوس ہو جاتا ہے۔ قریب ہی ایک بڑھیا سوت وغیرہ کات رہی تھی۔ مجھ سے ایک عورت کہنے لگی۔ آپ جانتے ہیں یہ بڑھیا کون ہے؟ میں نے کہا کیوں کیا بات ہے؟ کہا یہ اس قبر سے نکلنے والے کی ماں ہے، یہ شخص شراب پیا کرتا تھا، یہ بیچاری بڑھیا اس کو روکتی اور کہتی تھی۔ اللہ سے ڈر، کب تک شراب پیئے جائیگا؟ یہ کہتا تھا، تُو تو گدھے کی طرح آواز نکالتی رہتی ہے۔ کرنا خدا کا یہ ہوا کہ) یہ ایک دن عصر کے بعد مر گیا، اب ہر دن عصر کے بعد یہ قبر پھٹتی ہے، یہ باہر نکلتا ہے اور تین بار گدھے کی آوازیں کر کے قبر میں بند ہو جاتا ہے۔

یہ قصہ جمعیت اہلحدیث کے ترجمان ـــ الاعتصام ـــ کی ۶ اگست ۱۹۶۵ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا ـــ اور اس قسم کے قصے ان حضرات کی زبانوں اور قلموں پر عام ہوتے ہیں۔

لیجئے تازہ ترین سند ملاحظہ فرمایئے۔ لائل پور سے شائع ہونے والا ہفت روزہ ـــ المنبر ـــ (جو قدامت پسند مذہبیت کا علمبردار ہے) اپنی یکم جولائی ۱۹۶۶ء کی اشاعت میں، ملک کے عام حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے، مذہبی پیشوائیت کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے۔

مذہبی عناصر روز افزوں انتشار میں مبتلا ہیں۔ محکمہ اوقاف اور اسکی مشاورت پر دو مذہبی جماعتوں کی اجارہ داری نے ان دونوں کو غالب و آمر اور باقی تمام مذہبی جماعتوں کو مغلوب و مامور بنا کر رکھ دیا ہے۔ جو غالب ہیں وہ کم ظرفی کی حد تک موجودہ غلبہ سے فائدہ اٹھانے کی فکر میں ہیں، اور جو مغلوب ہیں وہ دیرپا ذہنی الجھن، عملی مشکلات، اپنے گروہ کی بیمائیگی ارباب اختیار کی جانبداری اور اپنے عقاید و افکار کے اضمحلال پر بے سوچے سمجھے، اور عقلی شعور کے ساتھ، تشویش مجسم بنتے چلے جا رہے ہیں۔ جتنے بھی فرقے اس ملک میں مذہب کے نام پر پائے جاتے ہیں ان سب میں انتشار بدرجۂ غایت موجود ہی نہیں، روز افزوں ہے۔ اور حسد و بغض، غیر صحت مندانہ مسابقت، نفعِ قلیل کیخاطر نقصانِ عظیم کو برداشت کرنے کا طرزِ عمل جاری و ساری ہے ..... حقیقتِ دین کی جگہ خود ساختہ رسومات نے لے لی ہے۔

یہ ہے ہمارے مذہبی عناصر کی واقعاتی تصویر۔ (ص۳)

ان حقائق کی روشنی میں آپ سوچئے کہ جن حضرات کا علمی سرمایہ، عقلی ذخیرہ اور کردار وہ ہو جو گذشتہ صفحات میں (خود ان حضرات کی زبانی) آپ کے سامنے آچکا ہے۔ اگر ملک کی قانون سازی کے اختیارات ان کے سپرد کر دیئے جائیں تو اس ملک کا کیا حشر ہوگا؟ حقیقت یہ ہے کہ ان حضرات کے اس مطالبہ کے جواب میں کرنے کا کام فقط اتنا تھا کہ حکومت، ملک کے مختلف فرقوں ——— شیعہ، سُنّی (سنیوں میں) حنفی، اہل حدیث، (حنفیوں میں) دیوبندی، بریلوی اور جماعت اسلامی کے نمائندگان کا ایک بورڈ بنا دیتی اور ملک کے سیاسی، اقتصادی، معاشرتی امور سے متعلق دس بیس موضوع تجویز کر کے، ان سے کہدیتی کہ اتنی مدت کے اندر ان سے متعلق (متفق علیہ) مسودات قانون مرتب کر دیں اس سے ان کے مطالبہ کی قلعی کھل جاتی! اور اگر اسے طولِ عمل سمجھا جاتے تو کم از کم ان سے اتنا ہی کہدیتی کہ یہ متفقہ طور پر بتائیں کہ ——— "رسول اللہؐ نماز کس طرح پڑھا کرتے تھے؟"

کرنے کا کام

دو، چار، دس، بیس دن تو ایک طرف، یہ حضرات ساری عمر میں متفقہ طور پر یہ نہیں بتا سکتے کہ رسول اللہ کا طریق نماز کیا تھا۔

سو جن حضرات کی کیفیت یہ ہو کیا وہ ایک مملکت کے لئے ضابطۂ قوانین مرتب کر سکتے ہیں؟۔ یہ زیادہ سے زیادہ اپنے فرقے کے، نکاح، طلاق، عقیقہ، جنازہ کے مسائل جانتے ہیں۔ انہیں کیا معلوم کہ مملکت کے تقاضے کیا ہوتے ہیں اور انہیں پورا کرنے کے لئے قوانین کس قسم کے چاہئیں علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں:-

قوم کیا چیز ہے قوموں کی امامت کیا ہے — اسکو کیا جانیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام

لیکن یہ جانیں یا نہ جانیں، مملکت کے راستے میں روڑے تو ضرور اٹکائیں گے۔

لیکن خود مملکت کی حالت یہ ہے کہ وہ اپنے نظم و اہتمام اور نگرانی و سرپرستی میں ان مکاتب، اور دار العلوموں کا جال ملک میں پھیلاتی چلی جا رہی ہے جن میں اس "علم و بصیرت" کے حامل "علماء" ہر سال ہزاروں کی تعداد میں گھڑے جاتے ہیں۔ ان کا مقدس فریضہ یہ ہوتا ہے کہ جہاں کہیں عقل و فکر کا کوئی چراغ نظر آئے اسے لپک کر بجھا دیں اور اس طرح ملک میں جہالت اور تاریکی کو عام کرتے جائیں۔

ان حالات میں مسئلہ قانون سازی تو ایک طرف، خود اس ملک کے مستقبل کے متعلق کچھ معلوم کرنے کے لئے کسی منجم کے پاس جانے کی ضرورت نہیں۔ سہ

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملّت کے گناہوں کو معاف!

ناظرہ قرآن شریف
اور
اسلامیات

جب قومیں سوچنا چھوڑ دیتی ہیں تو ان کے فیصلوں کے محرک جذبات ہوتے ہیں، فکر و شعور نہیں ہوتا نتیجہ اس کا یہ کہ ان کے فیصلوں کو نظر بظاہر دیکھئے تو وہ بڑے خوش آئند دکھائی دیں گے لیکن ذرا گہرائی میں جاکر ان پر نگاہ ڈالیئے تو ان کی حقیقت جلوۂ سراب سے زیادہ کچھ نہیں ہوگی۔ ہمارے ہاں بالعموم اسی قسم کے فیصلے ہوتے ہیں۔ ان کی تازہ مثال حکومت کے یہ فیصلے ہیں کہ اسکولوں میں بچوں کو ناظرہ قرآن شریف پڑھایا جائے اور اسلامیات کا مضمون بی۔ اے تک لازمی قرار دے دیا جائے۔ نظر بظاہر دیکھئے تو یہ فیصلے یکسر مستحق تبریک و تہنیت اور درخور تعریف و توصیف قرار پائیں گے۔ لیکن آیئے ذرا سطحی جذبات سے نیچے اُتر کر ان کا جائزہ لیں اور دیکھیں کہ ان کا نتیجہ کیا برآمد ہوگا۔ پہلے ناظرہ قرآن شریف کے عنوان کو لیجئے۔ "ناظرہ" سے مراد یہ ہوتی ہے کہ قرآن شریف کے الفاظ دہرائے جائیں، ان کے معانی، مفہوم، مطلب نہ سمجھا جائے۔

الفاظ ذریعہ ہوتے ہیں متکلم کے مافی الضمیر کو مخاطب کو سمجھانے کا۔ الفاظ سے کلام مرتب ہوتا ہے اور جب اس کلام کو صفحۂ قرطاس پر محفوظ کر لیا جائے تو ان صفحات کے مجموعہ کو کتاب کہا جاتا ہے۔ لہٰذا کتاب اس کلام کا مجموعہ ہوتا ہے جس سے ایک شخص اپنے خیالات دوسروں تک پہنچاتا ہے۔

لیکن ایک اور چیز ہے جسے سحر یا جادو (Magic) کہتے ہیں۔ اس میں بھی الفاظ بولے اور لکھے جاتے ہیں۔ لیکن ان الفاظ کے معانی کچھ نہیں ہوتے۔ ان کے متعلق عقیدہ یہ ہوتا ہے کہ ان الفاظ کے معانی سمجھنے کے نہیں۔ ان کی کچھ تاثیر ہے اور وہ تاثیر ان الفاظ کے دہرانے یا لکھنے سے پیدا ہوتی ہے۔

قرآن کریم ایک کتاب ہے۔ اس کے بھیجنے والے نے' افتتاحیہ (سورۃ فاتحہ) کے بعد اس کا تعارف یہ کہہ کر کرایا کہ ذَالِكَ الْكِتَابُ ــ یہ ایک عظیم کتاب ہے۔ اور پھر اس میں بار بار تاکید کی کہ اسے سوچ سمجھ کر پڑھو۔ اس کے مطالب و مقاصد پر غور و فکر کرو۔ اگر ایسا نہ کرو گے تو یہ کتاب تمہیں کچھ فائدہ نہ دے گی۔ قرآن کریم نے جو بار بار کہا ہے کہ یہ "کتاب" ہے تو اس سے اس نے اس حقیقت کو بھی اجاگر کیا ہے کہ اسے سحر (جادو) نہ سمجھ لینا کہ اس کے الفاظ دہراتے جاؤ اور سمجھو کہ ان الفاظ کے اندر تاثیر ہے۔ انہیں دہرانے سے وہ تاثیر پیدا ہو جائے گی ــ یہ ایک کتاب ہے۔ اس کے الفاظ کے معانی ہیں۔ اسے پڑھنے سے مقصد یہ ہے کہ اس کے الفاظ کے معانی سمجھے جائیں۔ اس کا مطلب اور مفہوم سمجھا جائے۔

جب امت کی گاڑی صحیح پٹڑی پر جا رہی تھی تو قرآن مجید کو کتاب ہی سمجھا جاتا تھا، لیکن جب یہ گاڑی دوسری پٹڑی پر جا پڑی، تو قرآن کریم کے متعلق یہ عقیدہ وضع کر لیا گیا کہ اس کے الفاظ میں "برکت" ہے اور انہیں دہرانے سے (سمجھنے سے نہیں بلکہ محض دہرانے سے) "ثواب" حاصل ہوتا ہے ــ اور ثواب بھی اس قدر کہ اس کے ایک ایک حرف کے بدلے دس دس نیکیوں کا ثواب ملتا ہے ــ مثلاً الٓمّٓ سے تیس نیکیوں کا ثواب حاصل ہوتا ہے ــ اور چونکہ مذہب میں (دین میں نہیں بلکہ مذہب میں) "اعمال" سے مقصد حصولِ ثواب ہوتا ہے تاکہ اس طرح آخرت میں نجات حاصل ہو جائے' اس لئے قرآن کریم کے الفاظ کو بغرض حصولِ ثواب' دھراتے چلے جانا' امت کا عام شعار بن گیا۔ اس طرح یہ قوم اس کتاب کو مسلسل اور متواتر پڑھتے رہنے کے باوجود' اس کے مطالب و مقاصد سے محروم ہو گئی۔ اور یوں یہ صحیفہ "کتاب" کے زمرے سے نکل کر "سحر" کے دائرہ میں چلا گیا۔ اس کے بعد اس کی آیات کے ورد' اور وظائف ہونے لگے۔ تعویذ لکھے جانے لگے اور اس طرح اسے سچ مچ کا "سحر بنا دیا گیا حتیٰ کہ اب" اعمالِ قرآنی" سے مراد ہی قرآنی آیات کے وظائف و تعویذ ہوتے ہیں ــ اور ایسا کرنے والے کو "عامل" کہا جاتا ہے۔

اس سے آپ نے دیکھ لیا ہو گا کہ کوئی ایسی کوشش یا اقدام' جو قرآن کو "کتاب" کے زمرہ سے نکال کر "سحر" کی (CATEGORY) میں لے جائے' غلط بنیادوں پر اٹھی ہوئی دیوار پر ایک اور ردا رکھنے کے مرادف ہے۔ یہ دین کی خدمت نہیں۔ امت کو اس سے اور دور لے جانے کی کوشش ہے ــ "ناظرہ قرآن" کا یہی نتیجہ ہوتا ہے۔

آپ ذرا غور کیجئے کہ اس فیصلہ پر عمل کرنے سے اسکولوں میں ہو گا کیا؟ طالب علم' اردو پڑھے گا

تاریخ، جغرافیہ، سائنس پڑھے گا۔ ان تمام مضامین کے پڑھنے پڑھانے کی کیفیت یہ ہوگی کہ استاد جو کچھ پڑھائے گا اسے بچوں کو سمجھائے گا۔ جو بات بچوں کی سمجھ میں نہیں آئے گی، وہ استاد سے اس کی مزید وضاحت چاہیں گے۔ جو کچھ سمجھ کر پڑھا ہوگا اسے لکھیں گے۔ اس طرح ان مضامین کی کتابیں ان کے علم میں اضافہ کریں گی۔ عین ان مضامین کے درمیان ایک پیریئڈ "قرآن شریف" کا بھی آئے گا۔ اس میں استاد جو کچھ پڑھائے گا اسے سمجھائے گا نہیں، صرف اس کے الفاظ پڑھنا اور یاد کرنا سکھائے گا۔ بچے جو کچھ پڑھیں گے اسے سمجھیں گے نہیں، صرف الفاظ یاد رکھیں گے۔ اور جب یہ کتاب ختم ہوگی تو وہ ان کے علم میں ایک لفظ کا بھی اضافہ نہیں کرے گی۔ ان کے ذہن میں بہرحال یہ سوال ابھر لیگا، کہ اس کتاب کے پڑھنے سے انہیں حاصل کیا ہوا؟ اس کا جواب یہ دے دیا جائے گا کہ اس کے الفاظ دہرانے سے ثواب ہوتا ہے۔ اس کی "تلاوت" موجب برکت ہوتی ہے۔ گویا ان بچوں کے دلوں میں شروع ہی سے یہ عقیدہ راسخ کر دیا جائے گا کہ قرآن کریم ایک "کتاب" نہیں، اس کا تعلق "سحر" سے ہے اور یہ عقیدہ عمر بھر ان کے شعور یا لاشعور میں جاگزیں رہیگا ــــ فرمائیے! یہ دین کی خدمت ہوئی یا آنے والی نسلوں کو دین سے بیگانہ رکھنے کی "مبارک کوشش"؟ "بیگانہ" ہی نہیں۔ یہ بچے جب بڑے ہوں گے تو یہ اسلام کو اوہام پرستی کا مظہر قرار دینگے اور اسے بنظرِ استخفاف دیکھیں گے۔

قرآن کریم کو ناظرہ پڑھانے کے بجائے، یہی ایک پیریئڈ اگر عربی زبان پڑھانے کے لئے مختص کر دیا جائے تو اس سے بچے قرآن کریم کو ناظرہ بھی پڑھ جائیں گے اور اس کا مطلب سمجھنے کے قابل بھی ہو جائیں گے۔ لیکن عربی زبان اس فرسودہ طریق سے نہ پڑھائی جائے جس سے سات سال میں گردانیں ہی ختم نہیں ہوا کرتیں۔ اسے سائنٹیفک طریق سے پڑھایا جائے تاکہ بچوں کو اس سے دلچسپی بھی پیدا ہو جائے اور ان کا وقت اور توانائی بھی بچے۔

اب اس فیصلہ کو لیجئے جس کی رُو سے "اسلامیات" کو بی۔ اے تک لازمی مضمون قرار دیا جا رہا ہے۔ اس وقت آٹھویں جماعت تک اسلامیات لازمی ہے۔ ہم قارئین سے درخواست کریں گے کہ وہ ان کتابوں کو اٹھا کر دیکھیں جو اسلامیات کے نام سے ان کے بچوں کو پڑھائی جا رہی ہیں۔ اور پھر سوچیں کہ کیا ان کتابوں سے طالب علموں کو صحیح اسلام کی تعلیم مل رہی ہے؟ جو کچھ ان کتابوں میں پڑھایا جاتا ہے اس سے بچوں کے ذہن عجیب و غریب الجھنوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور ان کی یہ الجھنیں سمجھدار والدین کے لئے مصیبت کا موجب بن جاتی ہیں۔ اس تعلیم سے ذہین بچوں کے دماغ میں جو سوالات پیدا ہوتے

ہیں وہ اگر مولوی صاحب سے پوچھیں تو اس کا جواب ڈنڈا ہوتا ہے۔ وہ گھر آکر ماں باپ سے پوچھتے ہیں۔ یہ اگر اس کی تردید کریں اور انہیں عقل و فکر کی رُو سے صحیح بات سمجھائیں تو بچے ایک عجیب کشمکش میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ صحیح بات کہنے سے وہ مولوی صاحب کے ہاتھوں پٹتے اور امتحان میں فیل ہو جاتے ہیں) (لازمی مضمون میں فیل ہو جانے کا مطلب پورے کے پورے امتحان میں فیل ہو جانا ہوتا ہے) انہیں مجبوراً ان باتوں کو صحیح کہہ کر پیش کرنا پڑتا ہے جنہیں ان کا دل صحیح نہیں مانتا۔ نتیجہ یہ کہ بچپن ہی سے انہیں یہ سکھا دیا جاتا ہے کہ دنیا میں کامیاب ہونے کا گُر یہ ہے کہ صحیح بات زبان پر نہ لاؤ۔ اگر غلط بات کہنے سے کامیابی ہوتی ہو تو اسے دھڑلے سے صحیح کہہ کر پیش کرو۔ یوں ہم ایک ایسی نسل تیار کر رہے ہیں کہ مصلحت بینی جس کا شعار اور منافقت جس کا عمل ہو۔

اس وقت تک یہ صورت آٹھویں جماعت تک تھی۔ اب بی۔ اے تک یہی سلسلہ چلے گا۔ اس سے جو نتائج پیدا ہوں گے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

کرنے کا کام یہ ہے کہ پہلے اسلامیات سے متعلق کتابیں مرتب کی جائیں، ان کتابوں کا انداز یہ ہونا چاہیئے کہ قرآن کریم نے زندگی کی جو بلند، مستقل اقدار عطا کی ہیں، انہیں عقل و فکر، علم و بصیرت کی روشنی میں پیش کیا جائے اور عصرِ حاضر کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر ان کی عالمگیر افادیت ذہن نشین کرائی جائے۔ ان کتابوں کے مسودات کو ملک میں عام کیا جائے اور اسلام دوست، روشن خیال، طبقہ سے ان سے متعلق آراء طلب کی جائیں، اسطرح جب اطمینان بخش طریق سے نصاب مرتب ہو جائے تو اسے درس گاہوں میں رائج کیا جائے۔

بلکہ ہمارے خیال میں تو اسلامیات کو ایک الگ مضمون کی حیثیت سے پڑھانے کی ضرورت ہی نہیں ہمارے اسکولوں اور کالجوں میں جو مضمون بھی پڑھایا جائے، اسلام کے پیش کردہ تصورات و اقدار کی روشنی میں اس کا ساتھ کے ساتھ تجزیہ کیا جائے اور یوں بتایا جائے کہ اس شعبے میں علمِ انسانی کہاں تک پہنچا ہے، اور وحی نے کیا تصورات پیش کئے ہیں۔ اس طرح اسلام، ہمارے پورے نظامِ تعلیم کی رگوں میں خونِ حیات بنکر دوڑے گا۔

البتہ جہاں تک فقہی معلومات کا تعلق ہے، یہ ایک الگ مضمون ہونا چاہیئے۔ اور عام کالجوں کے بجائے اسے لا کالج کے نصاب کا جزو قرار دینا چاہیئے۔ لیکن اس کی حیثیت مستقل دین کی نہیں بلکہ صرف اس قدر ہونی چاہیئے کہ قانون سازی کے سلسلہ میں ہمارے ہاں کیا کیا کوششیں ہوئی ہیں اور ان کا نہج کیا رہا ہے۔

ایک مضمون — اسلام کی تاریخ — ہے۔ مسلمانوں کی تاریخ نہیں بلکہ اسلام کی تاریخ — اس وقت اسلامک ہسٹری کے عنوان سے جو کچھ پڑھایا جاتا ہے وہ درحقیقت مسلمانوں کی تاریخ ہوتی ہے۔ اسلام کی تاریخ نہیں۔ اسلام کی تاریخ سے مراد یہ ہے کہ وہ دین جسے خدا نے نازل کیا — اور جسے محمد رسول اللہ والذین معہٗ نے ایک نظامِ معاشرہ کی شکل میں عملاً متشکل کیا، اور اسکے بعد وہ اس مذہب میں کس طرح تبدیل ہو گیا جو اس وقت مسلمانوں میں عام طور پر رائج ہے۔ لیکن اس قسم کی تاریخ تو وہاں پیش کی جا سکتی ہے جہاں مذہبی پیشوائیت کا اثر غالب ہو۔

بہرحال، یہ ضمنی باتیں تھیں۔ اس وقت ہم ان دو امور کی طرف توجہ مبذول کرانا چاہتے ہیں جن کا ذکر عمودی طور پر کیا گیا ہے — یعنے ناظرہ قرآن شریف اور اسلامیات کی تعلیم — کیا ہم اربابِ حل وعقد سے توقع کریں کہ وہ ہماری معروضات کو درخورِ اعتنا قرار دینگے؟

شکوک ⊙ شبہات ⊙ اعتراضات

- پیدا ہوتے ہیں۔ کس کے دل میں؟ نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کے دل میں!
- انکا جواب آپ کے پاس کیا ہوتا ہے؟ — ماتھے کی شکن، گھُرکی، لاحول!
- کیا اس سے انکے وہ شکوک رفع ہو جاتے ہیں؟

اگر آپ ایسا سمجھتے ہیں تو آپ فریبِ نفس میں مبتلا ہیں۔ یہ شکوک رفع ہونگے دلائل وبراہین سے — علم اور بصیرت سے — بشرطیکہ سمجھانے کا طریقہ بھی دلنشین اور جاذبِ توجہ ہو۔ اگر آپ فی الواقعہ کسی نوجوان کے دل سے شکوک وشبہات کی پھانسیں نکالنا چاہتے ہیں — تو — اُسے

سلیم کے نام خطوط

دیجئے۔ اور پھر دیکھئے کہ اس میں کیا انقلاب آتا ہے۔

جلد اول آٹھ روپے | جلد دوم چھ روپے | جلد سوم چھ روپے

ملنے کا پتہ: ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی۔ گلبرگ لاہور

دین کی باتیں

(سلسل)

پرویز صاحب کے درسِ قرآن کریم کے اہم نکات ـــ مرتبہ محترمہ ثریا عندلیب صاحبہ

(۱۹) تم خدائے رحمان کی تخلیق میں کسی قسم کا عدم تناسب نہیں دیکھو گے۔

(۲۰) جس قوم پاس دنیا میں مادی سامانِ زیست کے دروازے نہیں کھلتے اس کی عاقبت کبھی نہیں سنور سکتی۔ یہ خدا کا اٹل قانون ہے کہ جس کی دنیا خراب ہے اور وہ اس خرابی کو دور کرنے کی کوشش نہیں کرتا اس کی عاقبت بھی تباہ و برباد ہے۔

(۲۱) زندگی کے ہر شعبے میں قانونِ خداوندی کو سامنے رکھنا، یہ ہے وہ سب سے بڑی قوت جس سے مومنین غلط باتوں کے ارتکاب سے مجتنب رہتے ہیں۔ اس کو ذکر اللہ کہتے ہیں۔

(۲۲) تم اپنی اصلاح کی فکر کرو۔ اگر تم صحیح راستے پر جا رہے ہو تو غلط راستے پر چلنے والا تمہیں کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتا۔

(۲۳) جو کسی اچھے کام میں دوسرے کے ساتھ کھڑا ہو جاتا ہے تو اس کے خوشگوار نتائج میں اس کا بھی حصہ ہوتا ہے اور جو کسی خراب کام میں کسی کا ساتھ دیتا ہے تو اس کے مذموم نتائج کی ذمہ داری اس پر بھی عاید ہوتی ہے۔

(۲۴) تم معجزات اور کرامات کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہو۔ تم خود اپنے اندر جھانک کر دیکھو، اس میں ایسی ایسی محیر العقول قوتیں نظر آئیں گی جنکا تم قیاس و گمان بھی نہیں کر سکتے۔

(۲۵) حق و صداقت کا مقصد لے کر اٹھنے والوں کے ساتھ خدا کی تائید و نصرت برحق ہے یعنی یہ قوانینِ خداوندی کے اتباع کا فطری اور لازمی نتیجہ ہے۔

(۲۶) اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لو کہ خدا انہی کے ساتھ ہوتا ہے جو ثابت قدم رہتے ہیں۔

(۲۷) جب انسانی کوششیں قانونِ خداوندی سے ہم آہنگ ہوں تو ان کے فطری نتائج خدا کی تائید و رحمت کے محسوس پیکر ہوتے ہیں۔

(۲۸) مظاہر فطرت کے مشاہدہ اور کائناتی قوانین کے مطالعہ سے خدا کا نظامِ ربوبیت انسان کے سامنے بے نقاب ہو کر آجاتا ہے اور وہ اس رب العالمینی کی کارفرمائیوں اور کرشمہ سازیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتا ہے۔ (باقی آئندہ)

بابُ المراسلات

ملّت کا عزیز ترین سرمایہ

ضلع سیالکوٹ کے ایک گاؤں سے، جو گذشتہ جنگ میں ہندوؤں کے قبضہ میں چلا گیا تھا ــــ طلوع اسلام کے ایک دیرینہ خریدار کی طرف سے حسب ذیل مکتوب موصول ہوا ہے :-

"کافی مدت کے بعد آپ سے مخاطب ہو رہا ہوں۔ میرے پاس آپ کی شائع کردہ متعدد کتب تھیں۔ مثلاً ..... ان کے علاوہ اور بھی بہت سی کتابیں تھیں جن کی مجموعی تعداد تین سو بارہ تھی۔ اور جب سے رسالہ طلوع اسلام چھوٹے سائز پر چھپتا تھا..... اس وقت سے لے کر پچاسوں رسالے دوستوں سے اکٹھے کر رکھے تھے، مگر افسوس! سب ہندوستانی بربریت کی نذر ہو گئے۔ اب ہم نے اپنے گھر کو آکر دیکھا تو سوائے راکھ کے ڈھیر کے کچھ بھی نظر نہیں آیا۔ اب تک ہم بے گھر ہیں۔

پڑھنے کے لئے کوئی کتاب موجود نہیں اور پڑھنے کی عادت ہے..... اگر آپ اس سلسلہ میں کوئی مدد کر سکتے ہوں تو مہربانی ہوگی۔

مکتوب نگار نے جن کتابوں یا رسائل کا ذکر کیا ہے وہ اتفاق سے مطبوعہ ہیں اس لئے ان کی کسی نہ کسی طرح کمی پوری کی جا سکتی ہے۔ لیکن اس سے ایک بڑا اہم سوال سامنے آتا ہے۔ اس زمانے میں جنگ کے خطرہ سے نہ کوئی مقام محفوظ سمجھا جا سکتا ہے، نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ کب یہ آگ بھڑک اٹھے ــــ بالخصوص ہندوستان کی مکارانہ ذہنیت کے پیش نظر، پاکستان تو یوں سمجھئے جیسے کوہ آتش فشاں کے دہانے پر بیٹھا ہوا ہے کہ نہ معلوم کب یہ دبے ہوئے شعلے ابھر آئیں اور کب آگ کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا ہوا امنڈ آئے۔

یوں تو ملت کی کون سی اجتماعی متاع ایسی ہوتی ہے جسے جنگ کے شعلوں سے محفوظ رکھنا ضروری

نہیں ہوتا۔ لیکن ہمارے نزدیک امت کا علمی ذخیرہ اس میں سب سے زیادہ گراں بہا اور عزیز ترین قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس علمی ذخیرہ میں نہ معلوم کون کون سے نوادرات موجود ہیں اور وہ کہاں کہاں بکھرے پڑے ہیں۔ ان میں نایاب کتابیں بھی ہوسکتی ہیں اور عصرِ حاضر کے مصنفین کے غیر مطبوعہ مسودات بھی جو ہنوز ان کی اپنی تحویل میں ہوں۔ یہ بھی ان کا ذاتی نہیں بلکہ درحقیقت ملی سرمایہ ہے جس کا محفوظ رکھنا نہایت ضروری ہے۔ گذشتہ جنگ میں ہمیں خود سب سے زیادہ فکر اور پریشانی پرویز صاحب کے ان مسودات کی تھی جو ہنوز طبع نہیں ہوئے۔ ان کی حفاظت کی اس کے سوا کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی کہ انہیں زمین میں دفن کر دیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ سوال انفرادی نہیں اجتماعی سطح پر سوچنے کا ہے۔ ہمارے نزدیک اس کی بہترین صورت یہی ہوسکتی ہے کہ پاکستان کے بڑے بڑے شہروں کے قرب و جوار میں حکومت ایسے مقامات کا تعین کر دے جہاں حفاظت کا پورا پورا انتظام ہو۔ اور اس علاقہ کے کتب خانوں اور اربابِ علم کو اس امر کی اطلاع دے دی جائے کہ خطرہ کے وقت وہ اپنی نایاب کتابیں یا مسودات، اپنے اپنے بکسوں میں بند کر کے وہاں رکھ دیں۔ اس طرح یہ علمی خزانہ محفوظ رہ سکے گا۔ یا کم از کم اسے محفوظ رکھنے کی امکانی کوشش کرلی جائے گی۔ اگر ایسا نہ کیا گیا اور یہ متاعِ گراں بہا ضائع ہوگئی تو اس کی بازیابی کی کوئی صورت نہیں ہوگی اور یہ وہ نقصان ہوگا جس کی تلافی ہی نہیں ہوسکے گی۔ اجڑے ہوئے شہر تو دوبارہ بسائے جاسکتے ہیں، تلف شدہ علمی نوادرات کہاں سے مل سکیں گے؟ اور یہ حقیقت ہے کہ ؎

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

کیا ہم توقع کریں کہ اربابِ حل و عقد ہماری اس گزارش کو درخورِ اعتنا قرار دینگے؟

عائلی قوانین

سوال:۔ عائلی قوانین اس وقت اسلامی مشاورتی کونسل کے زیرِ غور ہیں۔ اس سلسلہ میں جماعت اسلامی کی طرف سے ایک ترمیمی مسودہ قانون مشاورتی کونسل کو بھیجا گیا ہے جو ترجمان القرآن کی حالیہ اشاعت (بابت جولائی) میں شائع ہوا ہے۔ طلوع اسلام میں اس سے پہلے اس موضوع پر بڑی تفصیل سے لکھا جاچکا ہے، لیکن اگر آپ جماعت اسلامی کی ترمیمات کا جائزہ لے کر اس کی تصریح کردیں

کر وہ کس حد تک قرآن مجید کے مطابق ہیں (یا مخالف)، تو اس سے قارئین کے سامنے ایک بار پھر صحیح پوزیشن آجائے گی۔

(۲) عائلی قوانین قریب چھ برس سے کالمعلقہ اُدھر لٹک رہے ہیں۔ کیا ان امور کا کبھی قطعی فیصلہ بھی ہو سکے گا۔؟

جواب:- عائلی قوانین میں چار اہم شقیں تھیں جو ہمیں ایک حد تک قرآن کریم کے احکام کے قریب لے جاتی تھیں۔ یعنے

(۱) یتیم پوتے کی وراثت۔

(۲) تعدّد ازدواج

(۳) طلاق ـــــ اور

(۴) نکاح نابالغاں۔

جماعتِ اسلامی نے اپنی ان ترمیمات میں ان چاروں کی مخالفت کی ہے اور ان کی ترمیم کے لئے جو کچھ تجویز کیا ہے، وہ قرآن کے یکسر خلاف ہے۔ مثلاً:-

(۱) قرآن کریم کی رُو سے، یتیم پوتا اپنے دادا کی وراثت سے حصہ لینے کا حقدار ہے۔ فیملی لاز آرڈیننس میں اسے یہ حصہ دلایا گیا ہے۔ جماعت اسلامی کی ترمیم یتیم پوتے کو وارث قرار نہیں دیتی۔

(۲) قرآن کریم کی رُو سے، ایک سے زیادہ بیویوں کی اجازت صرف اس شکل میں دی جا سکتی ہے جب معاشرہ میں ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ بیوگان اور یتامے کے مسئلہ کا کوئی منصفانہ حل نہ ملتا ہو۔ (سورۃ نساء۔ آیت ۳) ـــ حکومت کے آرڈیننس میں، ایک سے زیادہ بیوی کے لئے ـــ (۱) کونسل کی منظوری اور (۲) پہلی بیوی یا بیویوں کی اجازت ضروری قرار دی گئی ہے۔ لیکن جماعت اسلامی کی ترمیم اس قسم کی کوئی شرط عاید نہیں کرنا چاہتی، اور مردوں کو کھُلی چھٹی دیتی ہے کہ وہ جب جی چاہے ایک، دو، تین، چار، بیویاں کرتے جائیں۔ البتہ جس بیوی سے "ناانصافی" ہو رہی ہو، وہ عدالت سے اس کی مدافعت کرا سکتی ہے۔

(۳) قرآن کریم کی رُو سے، طلاق، خاوند کا انفرادی حق نہیں۔ اس کا فیصلہ ثالثوں کا ادارہ کر سکتا ہے۔ حکومت کے آرڈیننس میں کہا گیا ہے کہ طلاق کی صورت میں خاوند کو کونسل کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔ جماعت اسلامی کی ترمیم اس کا حق براہ راست خاوند کو دیتی ہے۔

(۴) قرآن کریم، نکاح کے لئے بلوغت کی شرط لازمی قرار دیتا ہے۔ نکاح ایک معاہدہ ہے اور نابالغ

معاہدہ کر ہی نہیں سکتا۔ حکومت کے آرڈیننس میں، بلوغت کی شرط رکھی گئی ہے لیکن جماعت اسلامی کی ترمیم، عدالت کی منظوری سے، نابالغ لڑکی یا لڑکے کے ولی کو نکاح کر دینے کا حق دیتی ہے۔ البتہ رخصتی کے لئے بلوغت ضروری قرار دیتی ہے۔ قرآن کی رُو سے نکاح اور رخصتی دو الگ الگ چیزیں نہیں۔

یہ ہے جماعت اسلامی کی طرف سے پیش کردہ ترمیمات کی پوزیشن۔ جہاں تک دوسرے سوال کا تعلق ہے کہ ان امور کا قطعی فیصلہ کب ہو سکے گا، تو اس کا جواب واضح ہے کہ جب حکومت میں اتنی ہمت ہو جائے کہ وہ جو فیصلہ قرآن کی روشنی میں، ملت کے مفاد اور پاکستان کے استحکام کے لئے ضروری سمجھے، اسے مذہبی پیشوائیت کی مخالفت کے علی الرغم، نافذ کر سکے۔ اس وقت ان امور کے قطعی فیصلے ہو جائیں گے۔

برقعہ میں بے پردگی

سوال :۔ میری لڑکی برقعہ اوڑھتی ہے۔ اس وقت تک وہ مطمئن تھی کہ وہ خدا اور رسولؐ کے حکم کی پابندی کرتی ہے لیکن کل ہی اس نے ایک رسالہ میں حسب ذیل روایت پڑھی ہے۔

> ام المومنین حضرت سلمےٰ رضی اللہ تعالےٰ عنہا بیان فرماتی ہیں۔ کہ (پردے کا حکم نازل ہو جانے کے بعد ایک مرتبہ) میں اور میمونہ رضؓ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے تھے کہ عبداللہ ابن ام مکتوم آ گئے۔ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے ہم دونوں کو پردہ کر لینے کا حکم دیا۔ کہ تم دونوں پردے میں چلی جاؤ۔ ہم نے کہا۔ یا رسولؐ اللہ! کیا یہ نابینا نہیں ہیں؟ نہ یہ ہم کو دیکھتے ہیں اور نہ یہ ہمیں پہچانتے ہیں۔ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ کیا تم دونوں اندھی ہو۔ تمہیں دکھائی نہیں دیتا؟ یعنی وہ تو دیکھنے سے معذور ہیں، لیکن تم تو ان کو دیکھ رہی ہو۔ اور پردہ دونوں ہی طرف سے ہے۔

اب وہ مجھ سے پوچھتی ہے کہ برقعہ میں بعینہٖ وہی صورت ہوتی ہے جو حضرت ابن مکتوم رضؓ کے آنے کے بعد، حضرت سلمےٰؓ اور میمونہ رضؓ کی ہوتی تھی۔ یعنی برقعہ پوش عورت کو تو کوئی مرد نہیں دیکھ سکتا لیکن وہ مردوں کو دیکھ سکتی ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق یہ جائز نہیں۔ اس کا سوال یہ ہے کہ وہ ارشادِ رسولؐ اللہ کے مطابق پردہ کس طرح کرے اور باہر کیسے نکلے؟ اگر کہا جائے

کہ برقعہ پوش عورت کو چاہیئے کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھے۔ اِدھر اُدھر یا سامنے نہ دیکھے۔ تاکہ کسی مرد پر اُس کی نظر نہ پڑے، تو اوّل تو اس سے راستہ چلنا دشوار ہو جاتے، اور دوسرے یہ کہ اگر نگاہیں نیچی رکھنے سے مقصد پورا ہو سکتا تھا تو رسول اللہؐ نے اپنی ازواج سے پردے کے اندر چلے جانے کے لئے کیوں فرمایا۔ یہ کیوں نہ فرمایا کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور ابن مکتومؓ کو نہ دیکھیں؟

جواب: آپ اس سوال کا جواب اس رسالہ کے مدیر سے دریافت فرمائیے یا مولوی صاحبان سے جو اس روایت کو رسول اللہؐ کی صحیح حدیث قرار دے کر اسے بڑے فخر سے دنیا کے سامنے پیش کیا کرتے ہیں؛

انسانی مسائل کے حل کرنے میں

عقلِ انسانی آج تک کن ارتقائی مراحل سے گزری اور اس نے کہاں کہاں اور کیا کیا ٹھوکریں کھائیں۔ تاریخ انسانی کی یہ عبرت آموز تفصیل آپ کو صفحہ پر ویز صاحب کی مشہور کتاب

انسان نے کیا سوچا؟

میں ملیگی۔ ہزاروں کتابوں کا نچوڑ۔ افلاطون اعظم سے لیکر آج تک گذشتہ اڑھائی ہزار سال میں دنیا کے چوٹی کے مفکرین، مؤرخین، اور علمائے اخلاقیات و عمرانیات اور ماہرین معاشیات و سیاسیات نے کیا سوچا؟

اسے پڑھئے اور سوچئے کہ وحی کی روشنی سے روگرداں اور محروم ہو کر نوعِ انسانی نے اپنے لئے کیا جہنم خرید لیا۔

قیمت بارہ ۱۲ روپے

ملنے کا پتہ

ادارہ طلوعِ اسلام۔ ۲۵ بی، گلبرگ ۲ لاہور

نقد و نظر

تحریکِ جماعتِ اسلامی — ایک تحقیقی مطالعہ

کرشن نگر لاہور میں ایک ڈاکٹر صاحب رہتے ہیں — اسرار احمدؒ — وہ ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کے علاوہ ایم۔ اے بھی ہیں۔ معلوم ہوا ہے کہ انہوں نے ایم۔ اے اسلامیات میں کیا تھا۔ اور عربی زبان میں بھی اچھی دستگاہ رکھتے ہیں۔ اس سے ان کے مذہبی ذوق کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ طالب علمی کے زمانہ میں اسلامی جمعیت طلبا کے سرگرم کارکن تھے — اور یوں تنظیمی طور پر نہ سہی، قلبی اور ذہنی طور پر جماعت اسلامی سے وابستہ ہو گئے۔ اس کے بعد تنظیمی طور پر بھی جماعت کے رکن بنے، اور تھوڑے سے عرصہ میں، اس میں اچھی پوزیشن حاصل کر لی۔ لیکن جوں جوں وہ آگے بڑھتے گئے، یہ حقیقت بے نقاب ہوتی گئی کہ مودودی صاحب نے جو اصول، جماعت کی دعوت کے زمانے میں پیش کئے تھے، اب وہ انہیں ایک ایک کر کے تیاگتے چلے جا رہے ہیں اور جماعت، دینی جماعت سے، خالصتاً دنیا دارانہ سیاست کی علمبردار ہوتی جا رہی ہے۔ ۱۹۵۶ء میں، جماعت اسلامی نے ایک جائزہ کمیٹی مقرر کی تھی کہ وہ تحقیق و تفتیش کے بعد، رپورٹ پیش کرے، کہ جماعت میں کیا کیا خامیاں ہیں اور وہ اپنے صحیح موقف سے کس حد تک ہٹ چکی ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب (نمائندہ جماعت اوکاڑہ) نے اس کمیٹی کے سامنے ایک مفصل دستاویز پیش کی تھی، جس میں ان خامیوں کی نشاندہی کی گئی تھی۔ ایسی جماعتوں میں اس قسم کی رپورٹوں کا جو حشر ہوا کرتا ہے، وہی کچھ اس رپورٹ کے ساتھ ہوا۔ لیکن ڈاکٹر صاحب، اس کے بعد، جماعت سے الگ ہو گئے (اُس زمانے میں جماعت کے بہت سے اکابرین اس سے علیحدہ ہوئے تھے) جماعت سے الگ ہونے کے بعد، ڈاکٹر صاحب خاموش بیٹھ گئے لیکن اب، دس سال کے بعد، انہوں نے اپنی اُس رپورٹ کو (ابتدائی تعارف کے ساتھ) من و عن شائع کر دیا ہے۔

یہ رپورٹ اس اعتبار سے منفرد ہے کہ یہ نہ تو جماعت اسلامی کے خلاف پراپیگنڈہ کی غرض سے لکھی گئی تھی اور نہ ہی اس سے ذاتی پبلسٹی مقصود تھی۔ یہ جماعت کے ایک رکن کے تاثرات تھے جو اس نے پرائیویٹ طور پر جماعت کے سامنے پیش کئے۔ اس لئے اس میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ ہمارے نزدیک اس جماعت کی "گندم نمائی اور جو فروشی" کی حقیقت کو سمجھنے کے لئے مؤثر بھی ہے اور مفید بھی۔ ایسا غیر جانبدارانہ جائزہ بہت کم پبلک کے سامنے آتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب، جماعت کا جائزہ لینے کے بعد جس نتیجہ پر پہنچے ہیں وہ یہ ہے کہ تقسیم ہند سے پہلے تک یہ جماعت اپنے اصولوں پر قائم رہی۔ لیکن اس کے بعد مودودی صاحب کے سامنے اپنی سیاسی قیادت آگئی۔ اور اس قیادت کے بعد انہوں نے عجلت سے کام لیا اور اس طرح اپنے ہر اصول سے انحراف کرتے چلے گئے۔

لیکن اگر ڈاکٹر صاحب، مودودی صاحب کی اُس نہانے کی روش پر بھی ذرا دور کھڑے ہو کر نگاہ ڈالیں تو ان پر یہ حقیقت بے نقاب ہو جائے گی کہ اُس وقت بھی مودودی صاحب کے پیش نظر خود اپنی قیادت تھی۔ اُس وقت انہوں نے اس مطالبہ کو زیادہ نکھار کر پیش نہیں کیا تھا، کیونکہ وہاں اُنکے مدِمقابل قائداعظم جیسی شخصیت تھی جن کے سامنے کسی کا چراغ نہیں جل سکتا تھا۔ پھر بھی انہوں نے خود قائداعظم کے خلاف کیچڑ اچھالنے میں بھی کچھ کمی نہ کی تھی ـــــ "ہوسِ اقتدار" ـــــ یہ ہے مودودی صاحب کی ساری جدوجہد کا بنیادی جذبہ محرکہ۔

بہرحال، ڈاکٹر صاحب نے اس کتاب کی اشاعت سے پاکستان اور اسلام کی ایک اچھی خدمت کی ہے۔ لیکن یہ جائزہ ۱۹۵۶ء میں لیا گیا تھا۔ اس کے بعد مودودی صاحب جس بے باکی سے اپنے ایک ایک سابقہ اصول کو توڑتے چلے گئے ہیں، وہ حقیقت اس سے بھی زیادہ عبرت آموز ہے جسے اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے۔ ہم ڈاکٹر صاحب سے درخواست کریں گے کہ وہ اسی انداز سے ۵۶ء سے ۶۶ء تک کے واقعات کا جائزہ لے کر اسے بھی پبلک کے سامنے پیش کریں۔ ان کی یہ کوشش بھی ثمربار ہوگی۔ ہمارے نزدیک یہ جماعت پاکستان اور اسلام، دونوں کے لئے درجہ اول کی دشمن ہے۔ اس لئے اس کی نقاب کشائی کی ہر کوشش ملک و ملت کی خدمت ہے۔

کتاب ۲۳۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ کتابت اور طباعت خوشگوار۔ قیمت مجلد ۴ روپے

ملنے کا پتہ:۔ دارالاشاعت اسلامیہ۔ بالمقابل ڈاکخانہ کرشن نگر۔ لاہور

مؤتمر عالم اسلامی کا لٹریچر

مؤتمر عالم اسلامی، جس کا سکرٹریٹ کراچی میں ہے، خاموشی سے اپنا کام کر رہی ہے۔ وہ غالباً زیادہ پبلسٹی کی قائل نہیں۔ لیکن ان کی طرف سے ہمیں جو لٹریچر موصول ہوا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا نشر و اشاعت کا شعبہ، عالم اسلام سے متعلق کس قدر مفید اور پُر از معلومات لٹریچر شائع کر رہا ہے۔ اس میں چھوٹے چھوٹے پمفلٹ بھی ہیں، متوسط پیمانے کے کتابچے بھی، اور ورلڈ مسلم گیزیٹیئر جیسی قریب پونے چھ سو صفحات پر مشتمل ضخیم کتاب بھی۔

آخر الذکر کے علاوہ، کسی پر قیمت درج نہیں جس سے مترشح ہوتا ہے کہ یہ لٹریچر مفت تقسیم کے لئے ہے۔ اگر ایسا ہی ہے تو بڑی خدمت ہے۔ اس لٹریچر میں، کرۂ ارض کے مسلم ممالک کے متعلق بڑی مفید معلومات جمع کر دی گئی ہیں۔ مثلاً ایک گیزیٹیئر ہی کو لیجئے۔ اس میں دنیا کی چھتیس آزاد مسلم مملکتوں، اور بائیس نیم آزاد مملکتوں کے متعلق معلومات کا وسیع ذخیرہ ہے۔ ہر مملکت کا محل وقوع، رقبہ، آبادی، سابقہ تاریخ، موجودہ سیاسی نظام، زبانیں، درآمد، برآمد، زرعی پیداوار، معدنی ذخائر، اور اس قسم کی دیگر معلومات درج ہیں۔ آخر میں تمام مسلم مملکتوں کے جھنڈوں کے عکس اور پورے کے پورے عالم اسلامی کا نقشہ بھی منسلک ہے۔ ایسی معلومات فراہم کرنے میں جو محنت درکار ہو سکتی ہے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے

یہ کتاب ۱۹۶۴ء میں مرتب کی گئی تھی اور ساتھ ہی یہ بھی لکھا گیا تھا کہ ۱۹۶۶ء کے اواخر میں اس کا جدید ایڈیشن شائع کیا جائے گا۔ مجلد کتاب کی قیمت پندرہ روپے ہے۔

ہم مؤتمر کے جنرل سیکرٹری، انعام اللہ خان صاحب کو مستحق مبارکباد سمجھتے ہیں جن کی کاوش اور کوشش سے اس قدر مفید معلومات پر مشتمل لٹریچر شائع ہو رہا ہے۔ ہمارے خیال میں اس لٹریچر کی عام اشاعت ہونی چاہیئے۔ یا کم از کم لوگوں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ فلاں فلاں موضوع پر معلومات مؤتمر کے ہاں سے دستیاب ہو سکتی ہیں۔

مُفت مجرّب دوا — برائے — دمہ - درد گردہ - پتھری

حاجی محمد دین، شیخ آئس فیکٹری، متصل گنیش کھوپرا ملز
لارنس روڈ۔ کراچی

نوٹ - جوابی لفافہ ضرور آنا چاہیئے۔

ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب:

عمل

طلوع اسلام کنونشن کا مقالہ

(۲)

قرآن ایک مثبت چیز دیتا ہے۔ تصوف کے ہاں نشوونما دنیا سے دور بھاگنے سے ہوتی ہے۔ کیونکہ ہر مادہ غلاظت ہے۔ عیسائیوں کی خانقاہوں میں تصوف عام پایا جاتا ہے۔ اور رہبانیت کی بنیاد انفرادی زندگی ہے۔ قرآن نے اس کے متعلق کہا۔

وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللَّهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا - (۵۷/۲۷)

رہبانیت خود انہوں نے ایک نئی بات نکال لی ہے ہم نے ان کو اس کا حکم نہیں دیا تھا۔ مگر انہوں نے اپنے خیال میں خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے خود ہی ایسا کر لیا (پھر جیسا اس کو نباہنا چاہئے تھے نباہ بھی نہ سکے۔

یہ ان کی انفرادی زندگی جیس ہر ایک اپنی اپنی نجات کی فکر میں لگا رہتا ہے اس سے بڑھ کر کوئی اور خود غرضی نہیں ہوسکتی جو ایک چیز وضع کی اور اسے نباہ بھی نہ سکے۔ اگر کھانا پینا چھوڑ دیا تو سانس تو آخر لے رہے ہیں۔ ہوا بھی تو مادہ ہے خدا سے براہ راست علم حاصل کرنے کا دعوے کرنے والوں کے اقوال میں بھی فرق ہے۔ ابن عربی کہتے ہیں کہ وحدت وجود ہے اور سرہندی کہتے ہیں کہ وحدت شہود ہے۔ یعنی دونوں خود اللہ سے براہ راست علم حاصل کرتے ہیں اور پھر آپس میں اختلاف کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ دونوں بھٹکے ہوئے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ نجات اس طریق سے حاصل نہیں ہوتی۔ قرآن کے نزدیک منازل ہیں جو انسان نے طے کرنے ہیں اور منازل اجتماعی زندگی سے طے ہوتے ہیں، جنت میں داخلہ بھی اجتماعی زندگی کے ذریعہ ہوتا ہے

فَادْخُلِيْ فِيْ عِبَادِيْ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ (۸۹/۲۹)

(میرے بندوں کے ساتھ شامل ہو پھر جنت میں داخل ہو)

وہ کہتے ہیں کہ صحیح اعمال کا نتیجہ غربت اور افلاس کی زندگی ہے۔ قرآن کہتا ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ (۲۴/۵۵)

تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور عمل صالح کئے ہم اس دنیا میں انہیں حکومت و خلافت دیتے ہیں اور ان سے یہ ہمارا وعدہ یقینی ہے۔)

یعنی ہم نے تو تمہیں پوری نوعِ انسانی کی نگرانی کے لئے پیدا کیا اور اس لئے پیدا کیا کہ ظالم کی کلائی مروڑو لیکن تم انفرادی زندگی لے کر بیٹھ گئے۔ قرآن کہتا ہے۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَبَيْنَهُمَا بَاطِلًا ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا (۳۸/۲۷)

کائنات کی بلندیوں اور پستیوں میں ہم نے کسی چیز کو بلا مقصد پیدا نہیں کیا۔ یہ جو خیال کرتے ہیں کہ دنیا باطل ہے۔ یہ کفار کا عقیدہ ہے)

یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم نے یہ چیز براہ راست خدا سے لی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ خدا کو دیکھنا تو ایک طرف، یہ ظن ہے علم پر بھی مبنی نہیں۔ اور کہا کہ کافروں کی کھینچیاں مجلس کے رہ جائیں گے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ جن قوموں میں تباہیاں آئیں یہ وہ تھیں جن میں تصوف آیا۔ انسانیت کی جتنی تباہ کاریاں دنیا میں باطل کے نظریے سے پیدا ہوئیں اور کسی چیز سے پیدا نہیں ہوئیں۔ تصوف کی بنا پر ایک الگ گروہ اولیاء اللہ کا بنایا جاتا ہے۔ اور اس گروہ کو اتنا اونچا درجہ دیا جاتا ہے کہ صحابہ کرام بھی اس زمرے میں نہیں آتے۔ پہلے یہ دیکھئے کہ قرآن اولیاء اللہ کسے کہتا ہے۔ اولیاء اللہ کے معنی اللہ کے فرماں بردار۔ اطاعت گزار۔ انسان خدا کا رفیق ادنیٰ ہے قرآن اولیاء اللہ کا کوئی الگ گروہ نہیں بناتا۔ اور کہتا ہے۔

اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ۔ لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ۔ (۱۰/۶۲-۶۴)

(یاد رکھو کہ جو خدا کے اطاعت گزار ہوتے ہیں انکی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ انہیں کسی قسم کا خوف و حزن نہیں ہوتا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لاتے ہیں اور قانون خداوندی کی نگہداشت کرتے ہیں (اسکا لازمی نتیجہ ہے کہ انکو خوف و حزن نہیں ہوتا) دوسرے مقام پر بھی آیا ہے (۲۰/۱۲۳) آدم سے کہا گیا کہ مایوس ہونے کی بات نہیں میری طرف سے رہنمائی ملتی رہیگی جو بھی اسکے مطابق زندگی بسر کریگا اس پر خوف و حزن نہیں ہوگا۔

اب دیکھئے۔ یہ کیفیت ملتی کیسے ہے۔ تصوف والے کہتے ہیں کہ جس قدر دنیا سے الگ ہوتے جاؤ اتنا

ہی خوف دور ہوتا جاتا ہے۔ قرآن کہتا ہے ۔ لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۔ ان کی یہ دنیاوی زندگی بھی خوشگوار ہوتی ہے اور آخرت کی بھی؛ تصوف والے کہتے ہیں کہ دنیا کی سلطنتیں ملنے کا ایک دور تھا جو ختم ہو گیا۔ قرآن کہتا ہے ۔ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۔ یہ وہ قانونِ خداوندی ہے جس میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ یہی زندگی کی بڑی کامیابی ہے کہ دنیا اور آخرت دونوں کی زندگی خوشگوار ہو۔ زندگی کے ٹکڑے نہیں کئے جا سکتے۔ جو یہاں کا اندھا ہے وہ آخرت کا بھی اندھا ہوگا۔ چنانچہ قرآن انہیں مومنین اور منفقین کی جماعت کو اولیاء اللہ کہتا ہے۔ تصوف والوں نے جو الگ گروہ اولیاء اللہ کا بنایا ہے۔ یہ وہی خالص دیانت کا تصور لئے ہوتے ہیں۔ دیانت والے بھی یہی کہتے ہیں کہ کئی چکروں سے گزر کر نروان ملتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں کوئی آرزو نہیں ہوتی۔ اس کے بعد انسان خدا سے مل جاتا ہے، اسی کو یہ اولیا لوگ وصال کہتے ہیں۔ موت نہیں کہتے۔ یہ کہتے ہیں کہ انسان مادی چیزوں سے آہستہ آہستہ الگ ہوتا جائے حتیٰ کہ لنگوٹی بھی اتار دے۔ لیکن انسان کتنی ہی ضروریات کو کم کرتا جائے آخر کچھ تو کھائے گا اور ہوا میں سانس بھی لے گا۔ اور جو کھائے گا وہ دوسروں کی محنت کی کمائی کھائے گا۔ دنیا سے الگ ہوتے جانا اور اس کی آلائشوں سے پاک ہوتے جانا انکے نزدیک تزکیہ نفس ہے۔ قرآن کے نزدیک تزکیہ کے معنی نشوونما کے ہیں۔ انسانی ذات ایک POTENTIAL FORM میں ملتی ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ اس چھپی چیز کو بیدار کرو۔ قرآن کہتا ہے کہ آؤ تمہیں بتائیں کہ تزکیہ نفس کیا ہے۔

فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَ اتَّقٰى (۹۲/۵)

جس نے اپنا مال دیا اور قانون خداوندی کی نگہداشت کی۔

اَلَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى ۔ (۹۲/۱۸)

اور جس نے اپنا مال دیا، خرچ کیا اور اپنی ذات کی نشوونما کی۔

یعنی تزکیہ نفس دوسروں سے مانگ کر کھانے سے نہیں ہو سکتا۔ یہ اپنے مال کو انسانیت کی بہبود کے لئے کھلا رکھنے سے ہو سکتا ہے۔

عقیدہ یہ دیا جاتا ہے کہ فلاں درگاہ پر جاؤ وہاں مراد مل جائے گی۔ یعنی یہ خدا کے محکمۂ قضا و قدر کو بھی رد کرتے ہیں۔ جہالت میں عام تصور یہ رہا ہے کہ جب بھی کسی طاقت سے ڈرو اس کے آگے جھک جاؤ۔ یہ کہتے ہیں کہ تمہیں ایسے تعویذ اور منتر بتاتے ہیں جس سے وہ دیوتا جس کے آگے تم جھکتے ہو وہ تمہاری مرضی کے مطابق کام کرنے پر مجبور ہو جاتے۔ دین جب ملا تو یہ سب غلط تصورات مٹ گئے لیکن تصوف جو جاہ کے دور کی پیداوار ہے جب آیا تو پھر ان غلط تصورات کو ساتھ لے آیا۔ یہ چیزیں پنپتی اس وقت ہیں

جب معاشرہ غلط ہو جاتا ہے تو افراد کو کوئی سہارا نہیں ملتا۔ جب انہیں اپنی مصیبتیں دور کرنے کے لئے کوئی سہارا نظر نہیں آتا تو درگاہوں کی طرف دوڑتے ہیں۔ یہ ہیں وہ لوگ جنہیں اولیاء اللہ کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ یہ تو خیر معمولی انسان ہوتے ہیں خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی کہلوا دیا۔

قُلْ اِنِّیْ لَآ اَمْلِكُ ضَرًّا وَّ لَا رَشَدًا۔ (۷۲/۲۱)

ان سے کہہ دو کہ میں تمہارے لئے کسی نفع و نقصان کا اختیار نہیں رکھتا۔

قُلْ اِنِّیْ لَنْ یُّجِیْرَنِیْ مِنَ اللّٰهِ اَحَدٌ وَّلَنْ اَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا۔

ان سے کہو کہ اگر میں اُس کی سرکشی اختیار کروں تو مجھے بھی پناہ دینے والا کوئی نہیں اور میں اس کے سوا اور کوئی جائے پناہ نہیں پاتا۔

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِیْ نَفْعًا وَّ لَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ۔ (۱۰/۴۹)

کہہ دو کہ میں اپنی ذات کے لئے بھی کسی نفع و نقصان کا اختیار نہیں رکھتا بجز اسکے کہ جو خدا کے قانون کے مطابق ہو۔

وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَیْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَیْرِ وَمَا مَسَّنِیَ السُّوْٓءُ

اور اگر میں غیب کی باتیں جانتا تو بہت سے فائدے جمع کر لیتا اور مجھکو کوئی تکلیف نہ پہنچتی۔

وَمَآ اَنَا اِلَّا نَذِیْرٌ وَّ بَشِیْرٌ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ۔

میرا تو یہ کام ہے کہ جو خدا کے قانون کو مانتے ہیں انہیں بتاؤں کہ خدا کے قانون کی خلاف ورزی سے کیا نقصان ہوتے ہیں اور اس کے مطابق زندگی بسر کرنے سے کیا خوشگواریاں ملتی ہیں۔

اِنَّكَ لَا تَهْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ۔ (۲۸/۵۶)

(اے محمد! جسے تم دوست رکھنا چاہتے ہو تو کتنا ہی چاہے کہ وہ شخص صحیح راستے پر چلے تو نہیں کر سکتا۔ جو اللہ کے قانون کے مطابق چلے گا وہی صحیح راستہ پر ہوگا۔) تیرا کام صرف یہ ہے کہ تو انہیں ہدایت پہنچا دے۔ صحیح راستے پر چلانا تیرا کام نہیں۔

پھر کہا:۔

مَنْ یَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ وَمَنْ یُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِیًّا مُّرْشِدًا۔ (۱۸/۱۷)

صحیح راستے پر چلنے والا وہ ہے جو اللہ کی ہدایت پر چلے، جو گمراہ ہو تو کوئی ولی اور مرشد اس کی مدد نہیں کر سکتا

یہ تو ہیں ان زندہ انسانوں کی باتیں جنہیں ولی کہا جاتا ہے۔ لیکن مرنے کے بعد ان کے اختیارات اور بھی

زیادہ ہو جاتے ہیں۔ ان مُردوں کے سامنے گڑگڑایا جاتا ہے۔ عقیدہ یہ ہے کہ یہ دل کی بات سمجھتے ہیں اور یہ عقیدہ ان لوگوں کا ہے جو قرآن کی تلاوت بھی کرتے ہیں، اسی قرآن کی جس میں لکھا ہے۔

اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا يَسْمَعُوْا دُعَآءَكُمْ وَلَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ۔

انہیں تم ہزار بار پکارو، یہ تمہاری بات نہیں سنتے، اگر سن بھی لیتے تو ان میں اتنی قوت ہی نہیں کہ اس کا جواب دیں۔

وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُوْنَ بِشِرْكِكُمْ ۔ (۳۵/۱۴)

(یہ جو تم ان کی ذات کے ساتھ شرک کر رہے ہو وہ قیامت کے دن اس سے انکار کر دیں گے)

وہ کہیں گے کہ ہم نے کب کہا تھا کہ ایسا کرو۔

ان کے ہاں ایک اور عقیدہ ہے کہ خدا تک انسان براہ راست نہیں پہنچتا۔ یہ صرف وسیلے کے ذریعے ہو سکتا ہے۔ اور وہ وسیلہ مرشد ہے۔ یہ عقیدہ پیری مریدی کی خشتِ اول ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ جلالِ خداوندی کی تاب ایک آدمی نہیں لا سکتا لیکن جب قلب مرشد کا پیالہ سامنے آجائے تو اس کے اندر جھانک کر خدا کو دیکھ سکتے ہیں۔ تصوف اور شاعری کا راز ہی تمثیلات میں ہے۔ حقائق پر ان کے دلائل نہیں ہوتے۔ ایک مثال گھڑی اور اسے پیش کر دیا۔ آپ حیران ہوں گے کہ اس عقیدے کی Support میں یہ ایک قرآن کی آیت بھی پیش کرتے ہیں،

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوْٓا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ وَجَاهِدُوْا فِيْ سَبِيْلِهٖ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۔ (۵/۳۵)

(اے مومنو! قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو اور اس کی طرف وسیلہ طلب کرو (اس کا طریق یہ ہے کہ) اس کے راستے میں جہاد کرو تاکہ تمہاری کھیتیاں پروان چڑھیں۔)

اب وسیلے کا لفظ آگیا، تو کیسے انکار ہو سکتا ہے کہ خدا کو ڈھونڈنے کے لئے وسیلے کی ضرورت ہے۔ لیکن وسیلہ ایک عربی کا لفظ ہے جس کے معنے اردو میں لئے جاتے ہیں۔ وسیلہ کے معنے ہیں درجہ، قرب، DEGREE۔ چنانچہ مطلب یہ ہے کہ تقویٰ اختیار کرو اور مدارج طلب کرو اور اس کا طریق یہ بتایا کہ جہاد کرو۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ گوشوں میں بیٹھ کر نفس کے ساتھ جہاد کرنا ہی جہاد ہے۔ لیکن قرآن نے یہ دروازے پہلے ہی بند کر رکھے ہیں۔

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ۔ اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى۔ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ فِيْمَا هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَھْدِیْ مَنْ ھُوَ کٰذِبٌ کَفَّارٌ ۔ (۳۹/۳)

ہم نے تمہارے پاس حق کے ساتھ کتاب نازل کی، تو اطاعت پذیری اور فرمانبرداری کو خالص اللہ کے لئے کر دو، دیکھو خالص فرمانبرداری خدا ہی کے لئے زیبا ہے اور جن لوگوں نے اس کے سوا اوروں کو اولیاء بنایا (جب ان سے کہا جاتا ہے کہ یہ تو شرک ہو گیا) وہ کہتے ہیں کہ ہرگز نہیں ہم تو ان کی فرمانبرداری اس لئے کرتے ہیں کہ خدا کا قرب حاصل ہو جائے (قرآن کہہ رہا ہے کہ یہ کتنی خود فریبی ہے) جن باتوں میں اختلاف کر رہے ہیں، خدا ان میں ان کا فیصلہ کر دے گا۔ یقیناً خدا جھوٹے نافرمانبرداروں کو ہدایت نہیں کیا کرتا۔

یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ اولیا ہمیں خدا کا مقرب بنا دیں گے۔ لیکن قرآن کہتا ہے:۔

اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ یَبْتَغُوْنَ اِلٰی رَبِّھِمُ الْوَسِیْلَۃَ اَیُّھُمْ اَقْرَبُ وَیَرْجُوْنَ رَحْمَتَہٗ وَ یَخَافُوْنَ عَذَابَہٗ ۔ (۱۷/۵۷)

یہ جسے بڑے سے بڑا مقرب سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کے ذریعے خدا کا قرب حاصل ہو جائیگا، ان کی اپنی کیفیت یہ ہے کہ وہ بھی ہمیشہ اس طلب اور خواہش میں رہتے ہیں کہ انہیں خدا کے ہاں اچھا مرتبہ مل جائے، وہ اس کی طرف سے سامانِ نشوونما کے متوقع اور اس کے قوانین کی خلاف ورزی کے تباہ کن نتائج سے خائف رہتے ہیں۔

یعنی جب یہ بڑے سے بڑا خود خدا تک پہنچنے کی آرزو کر رہا ہے تو ظاہر ہے کہ خدا کی فرماں پذیری کے لئے کسی وسیلے کی ضرورت نہیں۔ انسان نے خدا کا تصور ایک بادشاہ کا بنایا ہوا ہے۔ بادشاہ ہوگا، اس کے دربان ہوں گے، پھر مقربین ہوں گے، امیر وزیر ہوں گے — بادشاہ تک جو بات پہنچے گی اس کی سفارش سے پہنچے گی۔ پھر کوئی مجرم ہے تو سفارش پہنچا رہا ہے۔ رشوت دے رہا ہے، دربانوں کی منتیں کر رہا ہے۔ یہ سب اولیا اور فقرا اسی تصور کے تحت خدا اور اس کے بندوں کے درمیان کھڑے کر دیئے گئے ہیں۔ قرآن آیا اور اس نے ان سب باطل تصورات کی تردید کر دی اور کہا۔

وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ۔ اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ .... (۲/۱۸۶)

اے رسولؐ! جب میرے بندے پوچھیں کہ خدا تک کیسے پہنچا جا سکتا ہے، تو کہہ دے کہ میں ہر فرد کے قریب ہوں۔ جب کوئی بلانے والا مجھے بلاتا ہے تو میں اس کی ہر بات سنتا ہوں اور اس کا جواب دیتا ہوں۔

پھر کہا :-

نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ ۔ (۵۰/۱۶)

ہم اس کی رگِ جان سے بھی زیادہ قریب ہیں ۔

چنانچہ نزولِ قرآن کے بعد خالق و مخلوق کے درمیان سے سب پردے اٹھ گئے۔ حضرت عمرؓ اپنے عہدِ خلافت میں جب اُس میدان سے گزرے جہاں اونٹ چرایا کرتے تھے تو سجدے میں گر گئے۔ ساتھیوں نے پوچھا۔ یہ کون سا مقام ہے ؟ کہا کہ میں یہاں بکریاں چرایا کرتا تھا۔ باپ بڑا سخت گیر تھا، کام بھی لیتا تھا اور کھال بھی ادھیڑتا تھا۔ آج عمرؓ اور اس کے خدا کے درمیان کوئی چیز حائل نہیں۔ برادران ! پاکستان ۱۹ برس سے کشمیر جیسے مسائل میں گھرا ہوا ہے۔ سرزمینِ پاکستان کے اوپر اور نیچے اولیاء کی بھی کمی نہیں، لیکن کوئی نہیں جو خدا کے پاس سفارش کرے۔

قربِ خداوندی کا بھی ان لوگوں نے عجیب تصور بنا رکھا ہے۔ ان کے ہاں اکبر کے نورتنوں کی طرح مقربینِ خدا کے گروہ پیش ہوتے ہیں جس کا کاغذ آگے کیا دستخط کروا لئے۔ ان کے قربِ خداوندی کے تصور سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کسی مقام کے اندر گھرا ہوا ہے لیکن بات یوں نہیں بلکہ یوں ہے کہ انسانی ذات کے اندر صفاتِ خداوندی سمٹی ہوئی شکل میں موجود ہیں جوں جوں ان صفات کی نمود ہوتی جائے گی توں توں انسانی ذات کی نشوونما ہوتی جائے گی اور اتنا ہی انسان خدا کے قریب ہوتا جائے گا۔ اس نموِ ذات کا فائدہ خود اسی انسان کو ہوتا ہے کسی دوسرے انسان کے وہ کچھ کام نہیں آسکتا۔

ان لوگوں نے **خدا سے محبت** کا مفہوم بھی غلط لیا ہوا ہے۔ ایک ایسی چیز جسے کبھی دیکھا نہ ہو اور جو قیاس و گمان میں بھی نہ آسکے، اس سے محبت کرنا ایک PSYCHOLOGICAL IMPOSSIBILITY ہے۔ قرآن میں جہاں اللہ سے محبت کا ذکر آیا ہے وہاں اس سے مراد اللہ کے قوانین پر ثابت قدمی سے عمل کرنا ہے۔

یہ لوگ عقل کو مفلوج کر کے معجزات سے بات منوانا چاہتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ اگر مجبور کر کے مومن بنانا مقصود ہوتا تو ہم ان کو پیدائشاً مومن پیدا کرتے۔ قرآن انسانوں کی عقل و فکر کو نشوونما دینے آیا ہے نہ کہ مجبور کرنے کے لئے۔

وَ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا ۔ اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّ عِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا ۔ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ

قَبِيلًا - اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِى السَّمَآءِ ۚ وَ لَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ ؕ ۔۔۔ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّىْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا (۱۷/۹۰-۹۳)

وہ کہنے لگے کہ ہم تو ایمان نہیں لائینگے (جب تک تم معجزے نہ دکھاؤ) مثلاً ہمارے لئے زمین سے چشمے جاری نہ کردو، یا تمہارا کوئی کھجوروں اور انگوروں کا باغ ہو اور اس کے بیچ میں نہریں بہا نکالو، یا جیسا کہ تم کہا کرتے ہو، آسمان سے ہم پر ٹکڑے لاگراؤ یا تم خود خدا اور اس کے فرشتوں کو سامنے لا کھڑا کرو یا تیرے لئے ایک سونے کا محل تیار ہو جائے یا تم آسمان پر چڑھ جاؤ بلکہ ہم صرف تمہارے آسمان پر چڑھ جانے سے ہی ایمان نہیں لائیں جب تک کہ تو وہاں سے ایک لکھی لکھائی کتاب نہ اتار دے جسے ہم پڑھ کر دیکھ لیں کہ واقعی خدا نے لکھی ہے) (قرآن کا جواب سنیئے: کہتا ہے کہ) اے رسول! کہہ دے کہ میرا پروردگار اس سے بہت بلند ہے میں صرف ایک انسان ہوں اور میرا فریضہ یہ ہے کہ خدا کا پیغام تم تک پہنچا دوں۔

وَ قَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَ اِنَّمَاۤ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ (۲۹/۵۰)

کافر کہتے ہیں کہ اس پر اس کے پروردگار کی طرف سے معجزے کیوں نہیں نازل ہوتے کہہ دو کہ معجزے تو خدا کے پاس ہیں، میں تو صرف تمہیں تمہاری غلط روش سے کھلم کھلا آگاہ کرنیوالا ہوں۔ کیا یہ قرآن بذاتِ خود معجزہ نہیں جو تم اور معجزے مانگتے ہو؟

اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ (۲۹/۵۱)

کیا ان لوگوں کے لئے کافی نہیں ہے کہ تم پر کتاب نازل کی گئی ہے جو ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہے۔ اور کیا رسولؐ کی زندگی بذاتِ خود معجزہ نہیں؟

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۱۰/۱۶)

اس سے پہلے میں نے تمہارے اندر زندگی بسر کی ہے کیا اس سے سمجھ نہیں سکتے کہ میں سچا ہوں یا جھوٹا ہوں؟

قرآن کہتا ہے کہ اس سے زیادہ معجزات کی ضرورت ہے تو کائنات کی بلندیوں اور پستیوں پر نظر دوڑاؤ۔ قوموں کے عروج و زوال پر نظر دوڑاؤ۔ معجزہ وہ ہے جو قانونِ مکافاتِ عمل کے مطابق عاجز کرے۔ جب قانونِ خداوندی سے سرکشی کے نتیجہ میں صاحبِ جاہ و جلال اور باجبروت قوموں پر تباہی آتی ہے تو یہ ہوتا ہے

دراصل معجزہ۔ کیا فرعون جیسے ضرب المثل جابر حاکم کی سلطنت کو موسیٰ علیہ السلام جیسے بے گھر اصحابِ درانقلابی کے ہاتھوں تہس نہس کر دینا معجزہ نہیں تھا؟ کیا قائداعظم کے ہاتھوں ہندو اور انگریز جیسی قوموں کو عاجز کر دینا معجزہ نہ تھا؟ یہ ہیں ہمارے معجزات۔ ہمارے معجزات تمہاری عقل و فکر کو جلا دینے والے ہیں۔ اور تم وہ معجزے مانگتے ہو جو عقل و فکر کو مفلوج کر دیں۔ عقل و فکر کو مفلوج کر کے دو اور دو پانچ منوا لینا کوئی معجزہ نہیں۔ کرشن جی کی مورتی کی پوجا کرنے والے بھی خارقِ عادات چیزیں دکھاتے ہیں کہ آپ حیران رہ جائیں یہ TECHNICAL چیزیں ہیں۔ ہر آدمی کر سکتا ہے۔ چاہے دیانت والا ہو یا صوفی ہو یا HYPNOTIST ہو۔ دین سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ قرآن کرامتوں کی بنا پر صداقتوں کو منوانے نہیں آیا۔

برادران! یہ ہیں تصوف کے بنیادی عقاید۔ صدیوں سے یہی کچھ ہوتا چلا آ رہا ہے اگر کوئی اعتراض کرے تو جواب ملتا ہے کہ ہمارے اسلاف بھی اسی طرح کرتے چلے آئے ہیں کیا وہ قرآن کو نہیں سمجھتے تھے؟ لیکن جو کچھ میں نے اوپر بیان کیا ہے کیا یہ خدا کی کتاب نہیں کہہ رہی؟ اللہ کا شکر ہے کہ قرآن محفوظ ہے اور ہمیشہ محفوظ رہے گا۔

برادران! جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، طوالت کے ڈر سے میں اپنے بیان کے اس حصے کو چھوڑ رہا ہوں جس میں بابا فرید و دیگر اولیاء کے قصے، معجزے اور کرامات کا ذکر ہے۔ میں نے اس ضروری حصے کو بھی چھوڑ دیا ہے جس میں یہ بیان کرنا چاہتا تھا کہ ہمارے علمائے کرام میں سے بھی اکثر تصوف کے متعلق وہی عقاید رکھتے ہیں جو ہمارے اولیا اور پیر رکھتے ہیں، یہ بھی دم جھاڑ اور تعویذات کے اسی طرح قائل ہیں — یہ ختمِ نبوت کے بعد براہ راست علم حاصل کرنے کے بھی قائل ہیں اور ساتھ ہی ساتھ مرزائیوں سے مباحثے بھی کرتے ہیں۔

لیکن برادران! میں اسلام کے ایک مایۂ ناز فرزند کے متعلق چند الفاظ کہے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا۔ آپ کو شاید یاد ہوگا کہ جشنِ قرآن العظیم کے موقع پر میں نے عرض کیا تھا کہ تصوف ایک ایسا تند و تیز دریا ہے جس میں شاعرِ مشرق جیسے عظیم المرتبت انسان کی کشتی بھی ڈگمگا کے رہ گئی لیکن جناب پرویز صاحب ایک مشاق ملاح کی طرح اس کشتی کو بلا تکلف بھنور سے نکال کر لے گئے۔ میں معذرت کے ساتھ اس عظیم شخصیت کے تصوف کے متعلق چند نظریات پر روشنی ڈالتا ہوں جس نے یہ بھی کہا تھا کہ

"عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی"

"روزگارِ فقیر" کے مصنف نے پروفیسر یوسف سلیم چشتی کی زبانی یہ لکھا ہے کہ:

انہوں نے علامہ اقبال سے کہا کہ خدا کی ہستی کے عقلی دلائل تو باطل قرار پا چکے ہیں۔ اب اس کا ثبوت کیسے

دیا جائے۔ اس پر علامہ صاحب نے فرمایا کہ عقلی دلائل کی رُو سے وجودِ باری تعالیٰ کا اثبات نہیں ہو سکتا۔ اس کے اثبات کا طریقہ باطنی مشاہدہ یا مذہبی تجربہ ہے۔ خدا شناسی کا ذریعہ خرد نہیں، عشق ہے، جسے فلسفے کی اصطلاح میں وجدان کہتے ہیں۔ یہی تصوف کی بنیاد ہے۔ چنانچہ ان کے خطبات میں بالخصوص پہلے اور ساتویں خطبے کا موضوع (جلد اول۔ صفحہ ۱۷۷) یہ ثابت کرتا ہے کہ ادراکِ حقیقت علم و عقل کی رُو سے نہیں کیا جا سکتا۔ باطنی تجربہ اور مشاہدہ سے کیا جا سکتا ہے، جسے معرفت کہتے ہیں۔ حالانکہ قرآن میں اس باطنی تجربے یا مشاہدے کا کوئی ذکر نہیں۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں قرآنِ کریم نے زندگی کے حقائق وحی کی رُو سے عطا کئے ہیں اور ان کے سمجھنے کا طریقہ علم و عقل بنایا ہے۔ لیکن صوفیاء علم و عقل کے پیچھے لٹھ لئے پھرتے ہیں اور یہی مسلک علامہ اقبال کا ہے۔ جو باطنی مشاہدہ کو دل، عشق اور نظر وغیرہ کی اصطلاحات سے تعبیر کرتے ہیں اور علم و عقل کو اس کا حریف قرار دے کر اس کی تنقیص کرتے چلے جاتے ہیں۔ مثلاً بانگِ درا میں ان کی ایک نظم عقل و دل کے عنوان سے ہے۔ اس میں' دل' کی زبان سے کہتے ہیں:

علم کی انتہا ہے بے تابی! ✤ اس مرض کی مگر دوا ہوں میں
علم تجھ سے تو معرفت مجھ سے ✤ تو خدا جُو خدا نما ہوں میں

بالِ جبریل میں کہتے ہیں:-

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں
ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں

دوسری جگہ ہے:-

خرد سے راہرو روشن بصر ہے
خرد کیا ہے چراغِ راہگذر ہے
درونِ خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا؟
چراغِ راہگذر کو کیا خبر ہے!

(اور یہ کہ) عشق سراپا حضور ✤ علم سراپا حجاب

حتیٰ کہ وہ یہاں تک بھی کہہ گئے ہیں کہ:-

تازہ مرے ضمیر میں معرکۂ کہن ہوا
عشق تمام مصطفیٰؐ، عقل تمام بولہب

اس کا نتیجہ یہ کہ وہ ورد و وظائف کو کامیابی کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ روزگارِ فقیر کی دوسری جلد

میں ان کے بھتیجے شیخ اعجاز احمد صاحب کی زبانی روایت ہے کہ انہوں نے جب بی۔ اے کا امتحان دیا تو اس کی کامیابی کے لئے علامہ اقبال نے آیۂ کریمہ کا ورد کیا تھا۔ اور اس کی بابت اپنے والد ماجد کو لکھا تھا کہ امید ہے اعجاز کامیاب ہو جائے گا کیونکہ انہوں نے آیۂ کریمہ کا ورد شروع کر دیا ہے۔ اسی طرح شیخ صاحب موصوف کی دوسری روایت ہے کہ ایک دفعہ ان کی ایک پھوپھی صاحبہ نے علامہ صاحب کے سامنے خدا کے عدل و انصاف کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ وہ منصف ہے اور انصاف کرے گا۔ اس پر علامہ صاحب نے فرمایا کہ دعا کرنی چاہیئے کہ خدا ہمارے ساتھ اپنی صفتِ عدل کا مظاہرہ نہ کرے کہ ہم اس کے انصاف کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ وہ ہم پر اپنا فضل و رحم فرمائے۔ انہی عقاید کا اثر تھا کہ وہ صاحبِ نظر بزرگوں کے عجیب و غریب قسم کی کرامات کے قائل تھے۔ چنانچہ روزگارِ فقیر کے مصنف نے اپنے والد ماجد کی زبانی یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک مرتبہ علامہ صاحب نے ان سے کہا کہ سنا ہے داتا صاحب کی درگاہ میں آجکل کوئی بہت روشن ضمیر بزرگ کارفرما ہیں۔ انہیں ملنے کے لئے جانا چاہیئے میں ان سے ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ جب مسلمانوں سے خدا کا وعدہ ہے کہ وہ انہیں اس دنیا میں سرفرازیاں عطا کرے گا تو یہ اس قدر ذلیل و خوار کیوں ہیں؟ چنانچہ ان کے پاس جانے کا پروگرام طے ہو گیا۔ جب وقت مقررہ پر یہ صاحب علامہ صاحب کے پاس آئے اور کہا کہ آپ اس بزرگ کے پاس چلیں تو آپ نے کہا کہ سنو! یہاں کیا ماجرا گذرا۔ آج صبح میں کمرے میں بیٹھا تھا کہ علی بخش نے آکر کہا کہ کوئی درویش صفت آدمی آپ سے ملنے کے لئے آئے ہیں۔ میں نے کہا بلا لو۔ وہ درویش صفت آدمی میرے سامنے آیا میں نے کہا کہ فرمایئے آپ کیسے آئے۔ اس نے کہا تم مجھ سے کچھ پوچھنا چاہتے تھے میں تمہارے سوال کا جواب دینے آیا ہوں اور اس کے بعد مثنوی کا یہ شعر پڑھا۔ ؎

گفت رومی ہر بنائے کہنہ کآباداں کنند
تو نداني اول آں بنیاد را ویراں کنند

میں نے جو اوپر نظر اٹھائی تو وہ بزرگ سامنے موجود نہ تھے۔ علی بخش کو ہر طرف دوڑایا لیکن ان کا کہیں سراغ نہ ملا۔

اس قسم کے اور واقعات کا ذکر بھی علامہ صاحب کے ہاں ملتا ہے۔ وہ ان باتوں کے قائل تھے۔ تصوف کی اس تعلیم کا نتیجہ کیا ہوتا ہے، اس کے متعلق خود علامہ اقبال نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ وسیدنال ایک پنجابی شاعر تھے وہ کسی ویدانتی کے مرید ہو گئے۔ اس کے بعد کہتے ہیں۔ ؎

تھے ہم پوت پٹھان کے دل کے دل دیں موڑ
تن گئے رگھو ناتھ کے سکیں نہ تنکا توڑ

اس میں نہ کسی وحید خاں کی تخصیص ہے، نہ کسی رگھوناتھ کی خصوصیت یہ اس تعلیم کا لازمی نتیجہ ہے اور اس لئے اسے مسلمانوں کے ہاں رائج کیا گیا ہے کہ یہ دل کے دل مروڑ دینے والی قوم تنکا توڑ سکنے کے قابل بھی نہ رہے۔

برادران! مجھے آج سے دو ہفتہ پیشتر مدینہ پبلشنگ ہاؤس کراچی کی طرف سے بذریعہ ڈاک ایک مدنی جنتری ۱۹۶۶ء ملی ہے۔ ہمارے ہاں جو میڈیکل ڈائریاں آتی ہیں ان میں بھی بڑی معلومات درج ہوتی ہیں لیکن جو کچھ اس مدنی جنتری میں درج ہے یورپ والے اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔ اس میں سے تقدیر کا حال دیکھنے کے فالنامے، لڑکا ہوگا یا لڑکی، امتحان میں پاس یا فیل معلوم کرنے کا طریقہ، بیمار کی موت یا زندگی معلوم کرنے کا طریقہ، انسان کے بدن کے تلوں سے قسمت معلوم کرنا، علم نجوم سے اشیاء کی قیمتوں کی تیزی یا مندی دریافت کرنا، کون سے برج سے کون سا ملک منسوب ہے، بچے کے دانت نکلنے کا وقت اور اس کے خاندان کی قسمت پر اس کا اثر، نقشہ دوستی دشمنی و مساوات سیارگان، ہاتھ پر قسمت کی لکیر کی چار شکلیں، تعبیر نامہ خواب، شادی کس سے کرنی چاہیئے، کس سیارے کی ساعت میں کون سا کام، دنیا کے مختلف ممالک کے متعلق ۱۹۶۶ء کی پیش گوئیاں وغیرہ وغیرہ کے باب درج ہیں۔

برادران! جب علامہ اقبال جیسے قومی رہنما کا یہ حال ہے جو میں نے اوپر بیان کیا ہے تو ۱۹۶۶ء میں جبکہ تسخیر کائنات کرنے والے روس کا پرچم چاند اور زہرہ ستارے پر پہنچ چکا ہے۔ پاکستانی قوم اگر مدنی جنتری کے نشے میں مدہوش رہے تو اس پر کیا گلہ!

برادران! قرآن کے خلاف جو سازشیں اب تک یہاں بیان کی گئی ہیں وہ قرآن کے معانی کے متعلق تھیں۔ اس کے علاوہ ایک وہ سازش ہے جو خود الفاظِ قرآن کے متعلق ہے۔ یہ الفاظِ قرآن کے متعلق یقین کو شک میں بدلنے کی سازش ہے اس میں یہ خیال عام کر دیا گیا ہے کہ نبی اکرمؐ قرآن کریم کو مرتب کر کے موجودہ شکل میں امت کو نہیں دے گئے تھے اور قرآن کریم کے الفاظ میں پہلی صدی کے آخر تک تبدیلیاں ہوتی رہیں۔ بعض آیات جو نزولِ قرآن کے وقت قرآن میں موجود تھیں وہ اب موجود نہیں ہیں اور بعض آیات جو اس وقت قرآن میں موجود ہیں ان کا حکم منسوخ ہو چکا ہے اور یہ کہ خود نبی اکرمؐ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے یعنی اگر وہ کسی کو لکھواتے بھی ہوں گے تو کیا پتہ چلتا ہے کہ لکھنے والا کیا لکھتا ہے۔

مندرجہ بالا تمام سازشوں کا آغاز ماضی بعید میں ہوا۔ پھر یہ اسلاف کا سرمایہ اور ورثہ بن کر عقیدہ اور ایمان کی حیثیت اختیار کر کے ہم تک پہنچیں۔ لیکن ان کے علاوہ ایک اور سازش بھی ہے جس کے بیج بہت پہلے بوئے گئے تھے لیکن اس کے شگوفے ہمارے عہد میں پھوٹے اور ہمارے ہی عہد میں اسے

پر دان چڑھانے کی منظم کوششیں شروع ہوئیں اور اب تک جاری ہیں۔ قرآن کے خلاف سازشوں کے سلسلہ دراز میں یہ کڑی سب سے زیادہ دور رس ہے اور اس سے ہماری زندگی کے تمام گوشے متاثر ہوتے ہیں۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ الدین آج صرف قرآن کی دفتین کے اندر محفوظ ہے۔ اب یہ نہ ان کے پاس ہے جن کے پاس اس سے قبل آیا اور نہ ان کے پاس جو ایسا دعویٰ ہی نہیں کرتے۔ لیکن یہ سازش کہتی ہے کہ عالمگیر سچائیاں اور اخلاقی ضابطے تمام مذاہب میں یکساں طور پر پائے جاتے ہیں اس لئے تمام مذاہب کی سچائیاں اکٹھی کر لی جائیں اور ایک ایسا دین لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے جو سب کے لئے قابلِ قبول ہو۔ دوسرے مذاہب چونکہ کبھی اسلام کا مقابلہ نہیں کر سکتے اس لئے یہ کہا گیا ہے کہ کسی ایک مذہب کو دوسرے پر ترجیح نہیں۔

برادران! ان سازشوں میں سے ہر ایک بذاتِ خود ایک مکمل موضوع ہے اس لئے اگر زندگی نے مہلت دی تو دیگر مواقع پر انہیں بیان کرتا جاؤں گا۔ قرآن کے خلاف ان سازشوں کو منظرِ عام پر لانا بے حد ضروری ہے۔ بلکہ میں تو کہوں گا کہ اس کوشش کو ایک تحریک کی شکل اختیار کرنی چاہیئے۔ تاکہ بھولے بھالے عوام صدیوں سے جن زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں وہ ان سے آزاد ہوں۔ جب تک ذہن آزاد نہ ہو، قوم قرآن پر عمل کرنے سے بیگانہ رہے گی۔

(قرآن فہمی)۔۔۔ برادران! قرآن پر عمل کے متعلق ایک چھوٹا سا نکتہ باقی رہ گیا ہے جس کے بغیر میرا موضوع مکمل نہیں ہوتا۔ وہ یہ ہے کہ قرآن دراصل سمجھ میں اس وقت آنا شروع ہوتا ہے جب اس کے احکام پر عمل کیا جائے۔ یا جب اس کے احکام کے مطابق کائنات کو مسخر کرنے کے لئے مسلسل جدوجہد کی جائے، یا جب انسان خود ان حالات سے دوچار ہو جن کے متعلق قرآن نے احکام دیئے ہیں۔ جس نے کبھی سمندر نہ دیکھا ہو اس کے پاس اس کی خصوصیات لاکھ بیان کرتے جایئے سمجھ میں نہیں آئے گا کہ حقیقتاً سمندر کیا شے ہے۔ میں پہلے بھی ایک مرتبہ عرض کر چکا ہوں کہ جہاد کے متعلق قرآن کی آیات مجھے اس وقت سمجھ میں آئیں جب میں نے میدانِ جنگ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اور اپنے آپ کو ان حالات میں گھرا ہوا پایا جن کو قرآن کریم بیان کرتا ہے۔ ہمارے ملا زدہ طبقہ میں یہ تصور عام پایا جاتا ہے کہ بھوک ننگ اور افلاس اللہ کی طرف سے ایک آزمائش ہے اور اس کی سند قرآن سے پیش کرتے ہیں ۔۔۔ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ ۗ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ۔۔۔ حالانکہ یہ اور اس سے اگلی پچھلی آیات ہیں

مسلسل میدان جنگ کا ذکر چلا آرہا ہے۔ اس آیت کو میں نے بھی سینکڑوں مرتبہ پڑھا لیکن اس کا صحیح مفہوم محسوس شکل میں میدانِ جنگ ہی میں سامنے آیا۔ اس آیہ کریمہ میں جس خوف کا ذکر ہے یہ وہ خوف نہیں جس سے انسان سہم کر بیٹھ جاتا ہے اور بے چارگی کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ یا جسے عام معنوں میں خوفزدہ ہونا کہتے ہیں بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ میدانِ جنگ میں انسان کے تحت الشعور میں ہر وقت ایک خطرے کا الارم ہوتا ہے جس کی گھنٹی مسلسل بجتی رہتی ہے، حتیٰ کہ سپاہی جس وقت سوتا ہے اس وقت بھی بیدار ہوتا ہے۔ اس کا ردِ عمل یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہندوستانی سپاہی کی طرح ایک شخص اپنی جان بچانے کی فکر میں رہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پاکستانی مجاہد کی طرح اپنے نصب العین کی صداقت پر یقین رکھتے ہوئے اپنی جان کی پرواہ نہ کرے اور ٹینکوں کی آہنی دیوار کے سامنے ٹکرا جائے یہی وہ لوگ ہیں جن کا مثبت ردِ عمل ہوتا ہے جن کو قرآن نے صابرین کہا ہے۔

جس جوع کا ذکر اس آیت میں ہے یہ وہ بھوک نہیں جو ناداری اور بے بسی کی وجہ سے آتی ہے اور جو سامانِ نشو ونما کی غلط تقسیم کی وجہ سے آتی ہے۔ بلکہ یہ بھوک CONSTANT TENSION بے حد ذہنی اور جسمانی تھکاوٹ اور بے حد مصروفیت اور بعض اوقات بر وقت رسد نہ پہنچنے کی وجہ سے ہوتی ہے اور اس بھوک کی کیفیت کا احساس صرف اس شخص کو ہو سکتا ہے جس نے کبھی میدانِ جنگ دیکھا ہو جو لوگ استقامت کے ساتھ اس بھوک کو برداشت کرتے ہیں انہیں صابرین کہا گیا ہے۔

نقصٍ من الاموال ـــــ سے مراد یہاں وہ مال نہیں جو چوری کی وجہ سے یا کسی تجارت میں گھاٹے کی وجہ سے ضائع ہو جاتا ہے۔ بلکہ یہ مال کا وہ نقصان ہے جس سے پاکستان کا عام شہری آج پہلی مرتبہ آشنا ہوا ہے۔ ایک توپ یا ٹینک کی قیمت لاکھوں روپے اور ایک BOMBER ہوائی جہاز کی قیمت کروڑوں روپے تک پہنچ جاتی ہے۔ اندازہ لگائیے کہ ان چیزوں کے مسلسل دورانِ جنگ میں تباہ ہونے سے کس قدر نقصان ہوتا ہے۔ توپیں اور دوسرے فائر کرنے والے ہتھیار جب دن رات میں ایک دم کے لئے بھی نہیں تھمتے تو ان میں گولہ اور بارود کس قدر خرچ ہوتا ہے۔ پھر توپ کے گولے اور چھوٹے ہتھیاروں کی گولیاں کتنی ہیں جو نشانے پر صحیح بیٹھتی ہیں، پھر ان چیزوں کی رسد پر کتنا خرچ ہوتا ہے لیکن اس بے پناہ مالی نقصان کے بعد بھی مقصد کا حصول صرف اسی کے لئے مقدر ہے جس کا CAUSE درست ہو جس کا اپنے نصب العین کی صداقت پر یقین ہو اور جس کے قدم نہ ڈگمگائیں۔ یہی ہیں جن کو صٰبرین کہا گیا ہے۔ یہاں ضمناً یہ بھی عرض کر دوں کہ اگر اس آیت میں جوع سے مراد چیتھڑوں میں لپٹے ہوئے ملا کی بھوک ہے تو پھر نقص اموال کے کیا معنی؟ غریب ملا نے تو کبھی مال دیکھا ہی نہیں۔ تو پھر

یہ کس مالی نقصان کی آزمائش میں مبتلا ہے۔

والانفس —— یہاں جانوں کے نقصان سے مراد یقیناً وہ نہیں جو بیماری کی وجہ سے ہوتا ہے اور جس پر کہا جاتا ہے کہ جو خدا کو منظور تھا ہوگیا۔ اب صبر شکر کے سوا چارہ نہیں بلکہ یہاں وہ جانی نقصان مراد ہے جہاں گولہ اور بارود کی زد میں آکر لاشوں کے ڈھیر لگ جاتے ہیں۔ یہ وہ مقام ہوتا ہے جہاں کافر اور مومن کا فرق نظر آتا ہے۔ اول الذکر اپنے نصب العین اپنی ذات اور خدا کی ذات پر یقین رکھتے ہوئے پیٹھ دکھا کر بھاگتا ہے۔ لیکن آخر الذکر کے دل میں گرانی تک نہیں گذرتی۔ وہ لاشوں کے ڈھیر کے باوجود اپنے نصب العین کے حصول میں منہمک مردانہ وار آگے بڑھتا جاتا ہے۔

والثمرات —— نقص ثمرات سے بھی مراد یہ نہیں کہ پھل کھانے کو نہیں ملتے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ میدان جنگ میں ہر محاذ پر ایک OBJECTIVE سامنے ہوتا ہے جس کو فتح کرنے کے لئے لاتعداد جانوں اور مالوں کا نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ لیکن اس بے پناہ نقصان کے باوجود بھی ضروری نہیں ہوتا کہ یہ OBJECTIVE حاصل ہو جائے۔ کئی مقامات پر پسپائی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لیکن اس پسپائی کے دو مختلف ردعمل ہوتے ہیں جس سپاہی کا اپنے نصب العین پر یقین نہ ہو یا جس MERCENARY SOLDIER کا کوئی نصب العین ہی نہ ہو اس کے لئے یہ پسپائی مایوسی اختیار کر لیتی ہے۔ لیکن جس کا CAUSE درست ہو وہ اس پسپائی کو محض حالات کی مجبوری اور وسائل اور تدبر کی کمی سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتا۔ وہ اپنے ہوش وحواس قائم رکھتا ہے اپنے گردوپیش کا جائزہ لیتا ہے اور ثابت قدمی کے ساتھ اپنے حالات کو بہتر بنانے کی کوشش کرتا ہے اور نئے حملے کے لئے تیاری کرتا ہے۔ اسی کو ایک سپاہی کا MORALE کہتے ہیں اور یہی وہ لوگ ہیں جنکو صابرین کہا گیا ہے۔

صابرین —— صابرین سے بھی مراد یہاں وہ ملّا نہیں جو بھوک پیاس اور خوف سے دبک کر حجرے کے کونے میں بیٹھا ہے۔ فوج میں بھرتی کے وقت ایک سپاہی کی جسمانی صحت کے ساتھ ساتھ اس کی نفسیاتی کیفیت کا بھی امتحان کیا جاتا ہے مثلاً کہا جاتا ہے کہ فلاں دیوار پر چڑھ کے دکھاؤ۔ ایک سپاہی آتا ہے اور پہلی جست میں دیوار پر چڑھ جاتا ہے لیکن ضروری نہیں کہ اسے کامیاب قرار دیا جائے۔ ایک آتا ہے چڑھنے کی کوشش کرتا ہے اور گر جاتا ہے۔ اسی طرح کئی بار کوشش کرتا ہے لیکن کامیاب نہیں ہوتا۔ لیکن وہ کوشش کو نہیں چھوڑتا اور آخر میں دیوار پر چڑھ جاتا ہے۔ ایسا امیدوار یقیناً کامیاب قرار پاتا ہے —— کیوں؟ —— اس لئے کہ یہ وہ ہے جسے قرآن کی زبان میں صابر

کہا گیا ہے۔ اور جس نے آگے جا کر موپچے سر کرنے ہیں۔ چنانچہ اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ وہ مجاہد جو میدان جنگ میں چوکنے رہتے ہیں جو اس بھوک کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہیں جس کا ہنگامی حالات کی وجہ سے ان کو سامنا کرنا پڑتا ہے اور جو جان و مال کے اَن گنت نقصان کے باوجود عارضی ناکامیوں اور پسپائیوں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے دشمن کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہیں۔ ان کے صبر و استقلال کی وجہ سے اللہ تعالیٰ انہیں کامیابی اور کامرانی کی خوشخبری سناتا ہے۔

اذا اصابتہم مصیبۃ قالو انا للہ و انا الیہ راجعون — کا بھی یقیناً یہ مطلب نہیں کہ ان کے ہاں کوئی بڑا بوڑھا مر جاتا ہے تو کہتے ہیں کہ اللہ کی طرف سے آیا تھا اور اسی کی طرف لوٹ گیا۔ یہاں مصیبت سے مراد وہی محاذِ جنگ میں ناکامی ہے لیکن وہ سمجھتا ہے کہ اس ناکامی کی وجہ یہ ہے کہ قانونِ خداوندی کے اتباع میں کہیں خامی رہ گئی ہے۔ وہ اس پر غور و فکر کرتا ہے اس کا تدارک کرتا ہے قانون خداوندی کی طرف لوٹتا ہے اور آخر میں کامیاب و کامران ہوتا ہے۔

میں نے عرض کیا تھا کہ جب تک کائنات میں بکھری پڑی آیات اللہ پر انسان نظر نہ دوڑائے، اور تسخیرِ کائنات میں سرگرم عمل نہ ہو قرآنی مطالب واضح طور پر سامنے نہیں آتے۔ جوں جوں انسان زندگی کے کسی شعبے میں مثبت راہِ عمل اختیار کرتا ہے قرآن کی حقیقتیں کھل کر سامنے آتی جاتی ہیں یہ عمل تسخیرِ کائنات کے ضمن میں ہو یا بنی نوع انسان کی بہبود کے سلسلے میں — ایک چھوٹی سی مثال میرے سامنے ہے۔ قرآن کریم میں ہے (۲۴/۴۳) کہ بادل جب پہاڑوں کی چوٹیوں پر آتے ہیں تو وہاں برف بن کر جم جاتے ہیں۔ بعد ازاں یہی برف پانی بن کر بہہ نکلتی ہے اور جو شخص اس پانی سے فائدہ اٹھانا چاہے اس تک وہ پہنچ جاتا ہے اور جو ایسا نہ چاہے اس سے پانی کا رُخ دوسری طرف مُڑ جاتا ہے۔ بارش اور برف کے علاوہ اِنہی بادلوں سے بجلی نکلتی ہے۔

آج سے چند صدیاں پیشتر ایک عام انسان کے ذہن میں نہیں آ سکتا تھا کہ قرآن یہ بھی مفید مطلب بات کہہ گیا ہے لیکن آج جبکہ IRRIGATION SYSTEM عام ہو گیا ہے۔ اب یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ قرآن فَيُصِيبُ بِهِ مَنْ يَشَاءُ وَ يَصْرِفُهُ عَنْ مَنْ يَشَاءُ کہہ کر کیا پتے کی بات کہہ گیا ہے۔ دوسرے آج جس دریا کے اوپر بند بنایا جاتا ہے وہاں ساتھ ہی ساتھ پانی سے بجلی فراہم کرنے کے PLANT نصب کر دیئے جاتے ہیں، گویا بجلی کی پیداوار بھی پانی کے بہاؤ کا ایک جزو ہے۔ یہ موجودہ زمانے کی ایجاد ہے لیکن قرآن نے چودہ سو سال پیشتر جہاں بادلوں اور پانی کا ذکر کیا وہاں يَكَادُ سَنَا بَرْقِهِ کہہ کر پانی کی حرکتِ مسلسل اور بجلی کی پیداوار کو لازم و ملزوم قرار دے دیا۔

چنانچہ میں عرض یہ کر رہا تھا کہ جوں جوں انسان تسخیر کائنات میں آگے قدم بڑھاتا ہے۔ قرآنی الفاظ کے مطالب واضح ہوتے جاتے ہیں۔ ایک اور چھوٹی سی مثال پیش کرتا ہوں۔ قرآن کریم میں ہے کہ اجرام فلکی کا نظام ایک معینہ مدت تک جاری رہے گا۔

اَللّٰهُ الَّذِىۡ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَيۡرِ عَمَدٍ تَرَوۡنَهَا ثُمَّ اسۡتَوٰى عَلَى الۡعَرۡشِ وَسَخَّرَ الشَّمۡسَ وَالۡقَمَرَ‌ؕ كُلٌّ يَّجۡرِىۡ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى‌ؕ (۱۳/۲)

یہ اس خدا کی طرف سے ہے جس نے اپنے بڑے نظام فلکی کو فضا میں معلق کر رکھا ہے اور جیسا کہ تم دیکھتے ہو، کوئی ستون ان کو تھامے ہوئے نہیں۔ یہ اس لئے ہے کہ کائنات کا مرکزی کنٹرول خدا کے ہاتھ میں ہے اس طرح اس نے سورج اور چاند کو اپنی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے، ان میں سے ہر ایک، ایک مدت معینہ تک اپنے راستے پر چلتا رہے گا۔

اب سنیئے! تسخیر کائنات کرنے والوں نے اس نکتہ یعنے اَجَلٍ مُّسَمًّى کے متعلق کیا کچھ دریافت کیا ہے۔ موجودہ تحقیق یہ ہے کہ زمین کی عمر اس وقت (۴۵۰۰،۰۰۰،۰۰۰) ساڑھے چار ارب سال ہے۔ اس میں سے (۶۰۰،۰۰۰،۰۰۰) ساٹھ کروڑ سال کے حالات GEOLOGIST یعنی علم ارضیات کے ماہر پوری تفصیل کے ساتھ معلوم کر چکے ہیں۔ گو تاریخ دان ابھی تک گذشتہ ۶۰۰۰ سال کے حالات ہی معلوم کر سکا ہے۔ اس کائنات کے اندر اجرام فلکی کے ان گنت نظام ہیں، جن میں سے نظام شمسی ایک ہے۔ نظام شمسی میں ۹ بڑے کرے اور ہزاروں ASTROIDS یعنے چھوٹے کرتے موجود ہیں۔ ان بڑے کروں میں سے زمین ایک ہے۔ زمین پر جو زندگی نظر آتی ہے اس کا انحصار سورج کی اس توانائی پر ہے جو اس کے اندر ایٹم کی رگڑ سے پیدا ہوتی ہے۔ اس رگڑ کی وجہ سے سورج کا اندرونی ٹمپریچر (۳۶،۰۰۰،۰۰۰) تین کروڑ ساٹھ لاکھ ڈگری سنٹی گریڈ ہے۔ اس توانائی پیدا کرنے میں سورج کا وزن ہر ایک سیکنڈ میں (۴،۰۰۰،۰۰۰) چالیس لاکھ ٹن کم ہو جاتا ہے لیکن اس رفتار سے کمی کے باوجود یہ تخمینہ لگایا گیا ہے کہ سورج مزید (۱۶،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰) سولہ ارب سال تک اور توانائی پیدا کرتا رہے گا۔ یعنے زمین کے اوپر زندگی بھی زیادہ سے زیادہ اتنے یا اس سے بہت کم سال رہ سکتی ہے۔ یہ زمین کی گزشتہ عمر سے قریباً تین گنا زیادہ ہے۔ یہ کہ اجرام فلکی اپنی اپنی جگہ بغیر ستون کے کس طرح کھڑے ہیں یہ اس لئے کہ سورج کی کشش اور کروں کی CENTRIFUGAL FORCE کے درمیان توازن قائم ہے۔

یاد رکھیے کہ مجھے یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ نظام شمسی کے کتنے سائنس کے حسابی اندازے کی رُو سے زیادہ سے زیادہ اتنی مدت اور قائم رہ سکتے ہیں اور یہ کہ تسخیر کائنات نے قرآن کے اس دعویٰ کا عقلی ثبوت پیش کر دیا ہے۔ کہ اجرام فلکی ایک معین مدت تک چلتے رہیں گے۔ اس سے یہ غلط فہمی نہ ہو جائے کہ میں قیامت آنے کا وقت مقرر کر رہا ہوں اس کا علم از روئے قرآن صرف خدا کو ہے۔ (ہیڈ) ممکن ہے ایٹم بم کی لڑائی سے کل ہی دنیا تباہ ہو جائے یا اور دس سال یا دس ہزار سال کے بعد انسان اپنی تحقیق کے غلط استعمال سے اس دنیا کے ساتھ باقی کروں کو بھی تباہ کر بیٹھے۔

یہ وضاحت میں نے اس لئے کی ہے کہ میری سائنسی تحقیق کی بات سن کر مُلّا جھٹ سے نہ کہہ دے کہ یہ قرآن کے خلاف جا رہا ہے۔ حالانکہ مُلّا خود قرآن کے خلاف باتیں کرتا ہے جیسے ہم بچپن سے مُلّا کی زبانی سنتے چلے آ رہے ہیں کہ اب لوگوں کے گناہ زیادہ ہو گئے ہیں اس لئے قیامت آنے والی ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ فلاں مہدی آ جائے گا تو اس کے بعد قیامت آئے گی۔ اس کے علاوہ اور کئی عجب عجب نشانیاں قرب قیامت کی بتائی جاتی ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بس قیامت اب آئی کھڑی ہے۔

ایک باعمل اور بے عمل قوم کے نقطۂ نگاہ میں بھی کتنا فرق ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ایک مادہ پرست قوم عمل کے بعد بھی جنت ارضی حاصل نہیں کر سکتی کیونکہ قوانین خداوندی پر ایمان نہ ہونے کی وجہ سے اس کا خوف امن میں نہیں بدلتا۔ تاہم اس کے عمل کے نتائج بدستور مرتب ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن کتنے افسوس کی بات ہے کہ جب کوئی دوسری قوم اپنے عقل و فکر کے زور پر کوئی انکشاف کر لیتی ہے تو ہمیں اس وقت معلوم ہوتا ہے کہ یہ چیز صدیوں پہلے قرآن میں موجود ہے۔ ہم ہر شعبہ زندگی میں ریسرچ سے غافل ہیں۔ زبانی طور پر قرآن کی حقیقتوں کے اعتراف کے باوجود ہم قرآن کی واضح ہدایات سے مسلسل پہلو تہی کرتے چلے جاتے ہیں۔

مثلاً قرآن ایک ECONOMIC SYSTEM کی طرف رہنمائی کرتا ہے جو دنیا کے باقی ECONOMIC SYSTEMS سے الگ ہے لیکن ہم اس کی تحقیق کی طرف کبھی دھیان نہیں دیتے۔ مادہ پرستوں کے ایجاد کردہ سرمایہ دارانہ نظام کے ساتھ نہ صرف چمٹے ہوئے ہیں بلکہ اسے عین دین سمجھتے ہیں اس لئے کہ ہمارے پروہت اسی نظام سے چمٹے رہنے میں اپنی عافیت سمجھتے ہیں۔

برادران ـــــ! ہمیں بیماری سے شفا حاصل کرنے کے لئے ہمارے نشو و نما دینے والے

نے ایک نسخہ عطا فرمایا تھا۔ ہم ہیں کہ اس نسخہ کے الفاظ دہرانے میں مصروف ہیں۔ کبھی دواتیوں کے نام جنتر منتر کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ کبھی نسخہ کو چھوڑ کر دوسرے طبیبوں کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ کبھی سب کو چھوڑ کر کسی زیر زمین طبیب کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ نتیجہ ظاہر ہے — نہ خوف جاتا ہے — نہ حُزن چھوڑتا ہے — نہ ذلت اور مسکنت الگ ہوتی ہے — مرض سے شفا کا ایک ہی راز ہے اور وہ ہے نسخہ پر عمل — یہی ایک واحد راستہ ہے جو جنت کی طرف جاتا ہے —

خدا کرے کہ ہم اس پر چلنے کے قابل ہو سکیں!

پرویز صاحب کا
درسِ قرآن کریم

لاہور۔ ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲۔ ہر اتوار کی صبح ۱۰ بجے

کراچی۔ سندھ اسمبلی ہال۔ بندر روڈ۔ ہر اتوار کی صبح ۹½ بجے

لائلپور۔ پنجاب ڈیریز (۴/۲۰۸) پیپلز کالونی۔
ہر جمعہ کی شب۔ بعد نماز عشاء۔

لیہ۔ تھل ہوٹل نزد ریلوے اسٹیشن۔ ہر جمعہ کو بعد نماز جمعہ۔

ملتان۔ میسرز شاہ محمد اینڈ سنز۔ بیرون پاک دروازہ
ہر جمعہ۔ بعد نماز جمعہ۔

سرگودہا۔ $\frac{۱۲۰}{D}$ سٹلائٹ ٹاؤن۔ ہر اتوار۔ ۴½ بجے شام

راولپنڈی۔ الکوثر بلڈنگ۔ متصل زنانہ کالج۔ مری روڈ
ہر جمعہ، شام ۵ بجے

سیدن۔ سید محمد حسین شاہ صاحب۔ نمائندہ بزم سے وقت اور مقام دریافت کر لیا جائے۔

انگلستان میں یہ درس بزم طلوع اسلام بریڈ فورڈ کے زیر اہتمام نشر ہوتا ہے۔

طلوع اسلام کی شائع کردہ کتابیں
ذیل کے پتے سے بھی مل سکتی ہیں

(۱) کلاسیک بک سیلرز۔ ۴۲۔ دی مال۔ لاہور
(۲) انٹرنیشنل بک سروس۔ ۷۵۔ دی مال۔ لاہور
(۳) گوشۂ ادب۔ چوک انارکلی۔ لاہور
(۴) لاہور بک ڈپو ۶۵۔ دی مال۔ لاہور
(۵) بک سنٹر۔ چوک رنگ محل۔ لاہور
(۶) آئیڈیل بک ہاؤس۔ ۱۹۴۔ انارکلی۔ لاہور
(۷) مکتبۂ پاکستان۔ چوک انارکلی۔ لاہور
(۸) ماڈل بک سٹال۔ ٹولنٹن مارکیٹ۔ دی مال۔ لاہور
(۹) مرکز ادب۔ چوک انارکلی —— لاہور
(۱۰) نیشنل بک سٹال۔ چوک انارکلی۔ لاہور
(۱۱) مقبول اکیڈمی۔ سرکلر روڈ۔ لاہور
(۱۲) بک پیلس۔ گلبرگ مارکیٹ۔ لاہور
شریف سنز بک سیلرز۔ کارخانہ بازار۔ لائلپور

بسلسلہ
جمہوری آواز

اسلامی نظام

ریڈیو پاکستان لاہور کا ایک مستقل پروگرام "جمہوری آواز" ہے جس میں پنجابی زبان میں عوام (بالخصوص دیہاتیوں) کیلئے، علاوہ دیگر امور، عام فہم انداز میں تقاریر نشر ہوتی ہیں۔ اس سلسلہ میں ریڈیو کی دعوت پر پرویز صاحب نے کچھ تقاریر لکھ کر بھیجی ہیں جن کا پنجابی ترجمہ نشر ہوا ہے ہم اس سلسلہ کی پہلی کڑی (اصل اردو زبان میں) شائع کرتے ہیں۔ امید ہے عوام اسے مفید پائیں گے۔ 'والسلام'

دنیا میں انسانوں نے مل جل کر رہنا ہے۔ مل جل کر رہنے سے باہمی مفاد کا ٹکراؤ ہوتا ہے۔ اس سے کئی اختلافات پیدا ہو جاتے ہیں۔ بعض اوقات بات جھگڑے جھیلے تک پہنچ جاتی ہے۔ اسلام نے ایسا انتظام کر دیا ہے کہ اس قسم کے جھگڑے اور اختلافات فوراً نپٹا دیئے جائیں۔ تاکہ دنیا امن سے رہے۔ اس قسم کے انتظام کو نظام کہا جاتا۔ اسلام کے نظام میں ایسی خصوصیتیں ہیں جو دنیا کے کسی اور نظام میں نہیں ملتیں۔

جھگڑے نپٹانے کیلئے ضروری ہے کہ فیصلہ کسی قاعدے اور قانون کے مطابق ہو۔ یونہی دھاندلی سے کسی کے حق میں فیصلہ نہ کر دیا جائے۔ جب کوئی فیصلہ قانون کے مطابق کیا جائے تو اسے عدل یا انصاف کہتے ہیں۔ اس لئے اسلامی نظام میں ہر معاملہ کا فیصلہ عدل و انصاف کے مطابق ہوتا ہے۔

پھر وہ قانون جس کے مطابق فیصلہ کیا جائے ایسا ہونا چاہیئے۔ جو روز روز بدلتا نہ رہے۔ اگر ایسی صورت ہو کہ آج کوئی اور قانون ہے اور کل کوئی اور ۔۔۔ تو کسی کو اس کا اطمینان ہی نہیں ہوگا۔ کہ اس

کے جھگڑے کا فیصلہ کس قانون کے مطابق ہوگا۔ انسانوں کے بنائے ہوئے قانون روز بدلتے رہتے ہیں لیکن خدا کا بنایا ہوا قانون کبھی نہیں بدلتا۔ اسلامی نظام کی خصوصیت یہ ہے۔ کہ اس میں ہر فیصلہ خدا کے بنائے ہوئے قانون کے مطابق کیا جاتا ہے۔ یہ قوانین، خدا کی کتاب، قرآن شریف کے اندر درج ہیں۔ خدائے تعالےٰ نے فرمایا ہے۔ کہ مومن وہ ہیں جو اپنے معاملات کے فیصلے خدا کی کتاب کے مطابق کرتے ہیں۔ چنانچہ قرآن شریف کی سورۂ مائدہ کی چوالیسویں آیت میں ہے۔ کہ جو لوگ خدا کی کتاب کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہ کافر ہیں۔

دوسری ضروری بات یہ ہے کہ چھوٹے اور بڑے، ادنیٰ اور اعلیٰ، امیر اور غریب، کمزور اور طاقتور، سب پر ایک ہی قانون لاگو ہو۔ یہ نہ ہو کہ بڑے آدمی کا فیصلہ اور قانون کے مطابق ہو اور چھوٹے آدمی کا فیصلہ اور قانون کے مطابق۔ امیر آدمی کے لئے اور قاعدہ مقرر ہو اور غریب کے لئے اور۔ حاکم اور افسر کے لئے اور قانون ہو اور رعایا کے لئے اور۔ اسلامی نظام میں کبھی ایسا نہیں ہو سکتا۔ اس میں ہر ایک کا فیصلہ ایک ہی قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ اس میں چھوٹے بڑے، امیر غریب، طاقتور اور کمزور، افسر اور ماتحت میں کوئی تمیز نہیں کی جاتی۔ جس طرح نماز میں چھوٹے اور بڑے سب ایک ہی صف میں کھڑے ہو جاتے ہیں اسی طرح اسلامی نظام کی بارگاہ میں سب برابر ہوتے ہیں۔

اسلامی نظام میں نہ کوئی شخص رشوت دے کر دوسرے کا حق چھین سکتا ہے۔ نہ ہی ایسا ہوتا ہے۔ کہ جو رشوت نہ دے اس کا کام ہی نہ ہو۔ نہ ہی اس میں کسی کی سفارش چل سکتی ہے۔ نہ کسی کا اثر و رسوخ کام دے سکتا ہے۔ نہ ہی ایسا ممکن ہے کہ مجرم چھوٹ جائے اور بے گناہ پکڑا جائے۔ نہ ہی یہ کہ کرے کوئی۔ اور بھرے کوئی۔ اس میں بغیر کسی تردد اور پریشانی کے، دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جاتا ہے۔ اس میں مظلوم کی ازخود دادرسی ہوتی ہے۔ اور ظالم کسی پر زیادتی نہیں کر سکتا۔ اس میں انصاف حاصل کرنے کے لئے در در کے دھکے نہیں کھانے پڑتے۔ اس میں انصاف خود مظلوم کے دروازے پر آکر دستک دیتا ہے اور حقدار کو بلا کر اس کا حق اسے دلا دیتا ہے۔ اس میں مجرم کو کوئی شخص قانون کی گرفت سے بچا نہیں سکتا اور بے گناہ کو کسی قسم کا ڈر اور خوف نہیں ہوتا۔ اس میں کوئی شخص ظلم اور فساد کے لئے سر نہیں اٹھا سکتا اور ہر شخص کی جان، مال، عزت، آبرو، بالکل محفوظ ہوتے ہیں۔ اس میں نہ تو ملک کے اندر کسی قسم کی چوری چکاری یا دھاندلی کا ڈر ہوتا ہے۔ اور نہ ہی باہر کے کسی دشمن کی زیادتی کا خوف۔ کیونکہ یہ نظام، اپنے ملک کی سرحدوں کو بڑا مضبوط رکھتا ہے۔ اور اس کے پاس اتنی فوجی طاقت ہوتی ہے۔ کہ وہ ہر قسم کے دشمن کا مقابلہ کر سکے۔ وہ کسی دوسرے ملک کے خلاف زیادتی نہیں کرتا۔ لیکن کسی ملک کو اس کی بھی

کھلی چھٹی نہیں دیتا، کہ وہ اس پر زیادتی کرے۔ وہ دوسرے ملکوں کے ساتھ جو معاہدے کرتا ہے ان کی پابندی کرتا ہے۔ لیکن جب کوئی دوسرا ملک معاہدے کو توڑتا ہے۔ تو اس کا مقابلہ ڈٹ کر کرتا ہے۔

اسلامی نظام اپنے ہاں کے مظلوموں ہی کی حفاظت نہیں کرتا۔ دنیا میں کہیں بھی کسی پر ظلم اور زیادتی ہوتی ہو۔ وہ مظلوموں کی مدد کو پہنچتا ہے اور بلا معاوضہ ان کی مدد کرتا ہے۔

اسلامی نظام کا کام اتنا ہی نہیں کہ وہ کمزوروں کی حفاظت اور مظلوموں کی امداد کرے۔ وہ محتاج اور ضرورت مند کی پوری پوری مدد کرتا ہے۔ اس نظام میں کسی شخص کی کوئی جائز ضرورت رکی نہیں رہتی جو لوگ کام کرنے کے قابل ہوں وہ کام کرتے ہیں۔ لیکن اگر ایسا ہو کہ کام کرنے کے باوجود کوئی شخص اتنا نہ کما سکے جس سے اس کی اور اس کے بال بچوں کی ضروریات پوری ہو سکیں، تو اسلامی نظام اس کی اس کمی کو پورا کر دیتا ہے۔ اور اگر کوئی شخص کسی بیماری یا حادثے کی وجہ سے کام کرنے کے قابل نہ رہے۔ تو اسلامی نظام اس کی تمام ضروریات کو پورا کرنے کی ذمہ داری لیتا ہے۔ وہ جو کچھ ان لوگوں کو دیتا ہے صدقے اور خیرات کے طور پر نہیں دیتا۔ یہ کچھ انہیں اسی طرح ملتا ہے۔ جس طرح کسی سرکاری افسر کو تنخواہ، یا پنشنر کو پنشن ملتی ہے۔ اس نظام میں بچوں کی صحیح صحیح تعلیم اور تربیت ہوتی ہے اور بیماروں کے دوا دارو کا پورا پورا انتظام ہوتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ یہ تمام انتظامات کون کرتا ہے؟ اس کا جواب بڑا آسان ہے۔ جس طرح گاؤں کی پنچایت ہوتی ہے۔ اسی طرح اسلامی ملکوں میں قوم کے سرپنچ، جن کا چناؤ خود قوم کے لوگ کرتے ہیں۔ ایک جگہ جمع ہوتے ہیں اور وہ سب باہمی مشورے سے یہ تمام انتظامات کرتے ہیں۔ ان سرپنچوں کے چناؤ میں نہ کسی قسم کا دباؤ ہوتا ہے۔ نہ ووٹ خریدے جا سکتے ہیں۔ لوگ جس شخص کو سب سے اچھا، شریف، سمجھ دار، مخلص اور عمدہ قابلیت کا مالک سمجھتے ہیں۔ اسے اپنا نمائندہ چن لیتے ہیں۔ اور یہ سب مل کر ملک میں خدا کی کتاب کے مطابق حکومت قائم کرتے ہیں۔ اس کو اسلامی نظام کہا جاتا ہے۔ ہم نے پاکستان کا ملک اسی لئے حاصل کیا ہے۔ کہ اس میں اس قسم کا اسلامی نظام قائم ہو اور یہی وجہ ہے کہ پاکستان کو ہر دشمن کے حملے سے بچانا جہاد ہے۔

طلوع اسلام کا شائع کردہ لٹریچر

کراچی میں

محمد اسلام صاحب۔ نمائندہ بزم طلوع اسلام۔ 1001/۳ لوئس روڈ۔ نیو ٹاؤن سے مل سکتا ہے۔ دستی بھی اور خط لکھنے پر بذریعہ وی۔ پی بھی — نیز — القارئ کی صبح، سندھ اسمبلی ہال سے۔

عورت ـــــ دو آئینوں میں

ہفت روزہ جریدہ المنبر (لائل پور) کی ۱۵ جولائی ۱۹۶۶ء کی اشاعت میں ایک مضمون شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے ـــــ عائلی زندگی کا مقدس منشور ـــــ اس میں پہلے یہ بتایا گیا ہے کہ غیر مسلموں نے عورت کو کیا پوزیشن دی اور اس کے بعد یہ دکھایا گیا ہے کہ اسلام نے اسے کس قدر بلند اور واجب العزت مقام عطا کیا۔ اس مقالہ میں عورت کے متعلق غیر مسلموں کے جو اقوال درج کئے گئے ہیں ان کی مثال یہ ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ گولڈ اسمتھ کے خیال کے مطابق۔

کانٹوں سے بھری شاخ کو پھول خوبصورت بنا دیتا ہے اور غریب سے غریب گھر کو نیک شعار عورت جنت بنا دیتی ہے۔

رینالڈ نے کہا ہے۔

دنیا میں کوئی محل۔ کوئی ہیرا۔ اتنا قابل قدر نہیں ہوتا جتنی ایک پاکباز اور عفت مآب عورت بالخصوص جبکہ وہ حسین بھی ہو۔

گوئٹے کا قول ہے۔

ہر بلند مرتبہ مرد کی راہ نمائی عورت کے شیریں الفاظ کرتے ہیں

سٹینڈل کے قول کے مطابق۔

جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ مصیبت میں عورت گھبرا جاتی ہے وہ عورت کی فطرت سے لاعلم ہے۔ طوفان آجائیں۔ مصائب کی گھٹا چھا جائے۔ دولت چلی جائے۔ صحت رخصت ہو جائے۔ چاروں طرف تکلیفیں اور آفتیں ہوں۔ یہ سب دیکھ کر مرد گھبرا جاتا ہے۔ عورت نہیں گھبراتی۔

غیر مسلموں کے ان اقوال کو درج کرنے کے بعد، مقالہ میں لکھا ہے کہ" جہاں تک اسلام کا تعلق ہے اس نے .... عورت کو نہ صرف ایک معزز بلکہ ایک مقدس مقام عطا کیا ہے اور یہ اعزاز صرف اسلام ہی کو حاصل ہے جس نے عرب جیسی

جاہل قوم کے دماغ سے عورت کے متعلق فرسودہ خیالات کا قلع قمع کیا۔ اسلام نے عورت اور مرد کو برابر کا درجہ دیا اور حضورؐ نے اپنے ارشادات میں عورت کی قدر و منزلت پر خاص توجہ فرمائی۔" اس کے بعد، اس سلسلہ میں کچھ روایات درج کی گئی ہیں جو ان حضرات کے نزدیک حضور نبی اکرمؐ کی صحیح احادیث ہیں۔ ان روایات میں کہا گیا ہے:-

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول مقبول نے فرمایا کہ لوگو میں تم کو وصیت کرتا ہوں کہ بیویوں کے ساتھ نیک سلوک کیا کرو۔ یاد رکھو۔ عورت پسلی سے پیدا ہوئی ہے اور سب سے بڑی پسلی ہی سب سے زیادہ ٹیڑھی پسلی ہے اگر تو عورت کو بالکل سیدھا کرنا چاہے گا تو وہ ٹوٹ جائے گی۔ ہاں ٹیڑھا رکھ کر ہی کام لے سکتے ہو۔ لوگو! میں پھر کہتا ہوں کہ بیویوں کے ساتھ نیک سلوک کرنا۔

ایک اور روایت ہے۔

ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ میں کسی غیر اللہ کے سجدے کو جائز سمجھتا تو عورت کو حکم دیتا کہ خاوند کو سجدہ کرے۔

ایک اور روایت ہے۔

حضرت عمران بن حصینؓ کا بیان ہے کہ حضور انورؐ نے فرمایا میں نے جنت میں جھانک کر دیکھا۔ اکثر لوگوں کو فقراء میں سے پایا۔ اس کے بعد دوزخ میں دیکھا۔ وہاں اکثر رہنے والی عورتیں دیکھیں۔

وہ تھے عورت کے متعلق غیر مسلموں کے اقوال۔ اور یہ ہیں، عورت کے متعلق، ان حضرات کے خیال کے مطابق حضور نبی اکرمؐ کے ارشادات گرامی جن کے درج کرنے کے بعد مضمون میں کہا گیا ہے کہ

عائلی زندگی کا یہ وہ مقدس منشور ہے جو زندگی کو مطمئن، خوش حال اور بابرکت بناتا ہے۔

یہ ہے وہ طریق جس سے ہمارا مذہب پرست طبقہ دنیا کے سامنے اسلام کی افضلیت اور حضور نبی اکرمؐ کی عظمت و رفعت پیش کرتا ہے!

اور یہ ہے نمونہ ان حدیثوں کا جن کے متعلق اگر یہ کہا جائے کہ یہ روایات وضعی ہیں۔ تو اسے "فتنۂ انکار حدیث" قرار دے کر شور مچا دیا جاتا ہے کہ اسلام خطرے میں ہے۔

اب اس قسم کے محبان اسلام کے متعلق اس سے زیادہ اور کیا کہا جا سکے کہ

ہوئے تم دوست جس کے اس کا دشمن آسماں کیوں ہو!

اسلام اور اسلام

پرویز صاحب کی تقریر

جس سے انہوں نے

طلوعِ اسلام کنونشن ۱۹۶۶ء سے خطاب کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آرٹ اور اسلام

گلاب کے پھول کے متعلق کسی طبیب سے پوچھئے۔ وہ بتائے گا کہ اس کا مزاج حار و یابس ہے اور تاثیر کے اعتبار سے ملین اور مُدر۔ خواص کی طرف آیئے تو یہ مقوی اور مفرح قلب ہے اور جگر کی اصلاح میں بھی مدد کرتا ہے۔ اس کے عرق اور گلقند کا شمار منفعت بخش ادویات میں ہوتا ہے۔ فطرت نے اس میں بڑے فوائد رکھے ہیں۔

لیکن یہی پھول جب ایک ایسے صاحب ذوق کی نگہ حسن شناس کے سامنے آئے جسے فطرت نے حسِ لطیف سے نوازا ہو، تو اسے اُس کے اندر دل کش رعنائیوں اور کیف آور زیبائیوں کی ایک دنیا مسکراتی، مچلتی، کھیلتی ناچتی دکھائی دے گی۔ اس کی نرم و نازک پتیوں کی لطافت۔ اس کی شفق آمیز رنگینیوں کی نظافت۔ اس کی نکہتِ جاں نواز کی عطر بیزیاں۔ اس کی تشنگی و شادابی کی مسرت خیزیاں۔ ہر حشمِ جمال آشنا کو یہ کہہ کر دعوتِ نظارہ دیں گی کہ

جمالیاتی پہلو

مژہ بر ہم مزن تا نشکنی رنگِ تماشا را

اور کشش و جذب کا یہ عالم، پھولوں تک ہی محدود نہیں۔ اس نگاہ سے دیکھئے تو صحنِ چمنِ کائنات کا ایک ایک گوشہ، دامانِ باغبان و کفِ گل فروش کا آئینہ دار نظر آئے گا۔ یہاں کوئی شے ایسی نہیں دکھائی دے گی جس میں افادی پہلو (UTILITARIAN ASPECT) کے ساتھ جمالیاتی پہلو (AESTHETIC PHASE) موجود نہ ہو۔ سورج کی نورپاشیوں میں، چاند کی ضیا باریوں میں۔ ستاروں کی مرصع کاری میں، کہکشاں کی زرنگاری میں۔ بادلوں کی سبک خرامی میں، نسیم سحر کی خوش پیامی میں۔ سمندر کی تلاطم خیزیوں میں، ندی کی سکوت آمیزیوں میں۔ سرو قامت درختوں کی پُرشکوہ صف آرائی میں، اور ان کی طرف لپک کر آنے والے پرندوں کی نغمہ سرائی میں۔

غرضیکہ نگارخانۂ کائنات کی کسی شے کو لیجئے، اس میں منفعت بخشی کے ساتھ ساتھ، جمال آفرینی، یوں سموئی ہوئی نظر آئے گی جیسے کسی تندرست و توانا، محوِ خواب بچے کے خاموش لبوں کی بہار آفریں مسکراہٹ،

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست

صدرنگ ربوبیت

حقیقت یہ ہے کہ خدا نے جب انسان کی پروردگاری (نشوونما۔ ربوبیت) کا ذمہ لیا، تو ضروری تھا کہ اس کی زندگی کے ہر گوشے کے لئے سامان نشوونما مہیا کیا جاتا۔ انسان کی ضروریات، طبیعی ہی نہیں جذباتی بھی ہیں اور اس کے جذباتی تقاضوں کی تسکین کے لئے ضروری تھا کہ اس کیلئے مہیا کردہ سامان نشوونما میں افادی اور جمالیاتی دونوں عنصر موجود ہوتے۔ حیوان اور انسان میں ایک مابہ الامتیاز خصوصیت یہ بھی ہے کہ حیوان کے تقاضے محض طبیعی ہوتے ہیں لیکن انسان کو ..... ذوقِ جمالیات بھی ودیعت کیا گیا ہے۔ ایک گائے کے نزدیک، پھول اور گھاس، یکساں چارہ اور شکم پُری کا سامان ہیں۔ لیکن انسان ان دونوں میں تمیز کر سکتا ہے، بشرطیکہ وہ حیوانی سطح سے ابھر کر انسانی سطح پر آچکا ہو۔

لیکن جس طرح انسان کی طبیعی زندگی کے تقاضوں کی تسکین کے لئے چند قواعد و ضوابط کی ضرورت ہے اسی طرح اس کی جذباتی زندگی کے تقاضوں کے پورا کرنے کے لئے بھی حدود و قیود لاینفک ہیں۔ خدا کی طرف سے

حدود و قیود

عطا کردہ دین، وہ حدود و قیود متعین کرتا ہے جن کے اندر رہتے ہوئے انسان کی طبیعی اور جذباتی زندگی کے تقاضے پورے کرنے سے، انسان کے جسم اور اس کی ذات، دونوں کی نشوونما ہوتی جاتی ہے اور اس طرح انسان اس دنیا میں بھی جنت بداماں زندگی بسر کرتا ہے، اور اس کے بعد کی زندگی میں بھی، مزید ارتقائی مراحل طے کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ تفصیل اس اجمال کی، میں ذرا آگے چل کر بیان کروں گا۔

دین خدا کی طرف سے، حضرات انبیاء کرامؑ کی وساطت سے انسانوں کو ملتا رہا۔ لیکن انسانوں نے اس میں اپنے خیالات و نظریات کی آمیزش کر کے، اسے کچھ سے کچھ بنا دیا۔ دین کی اس مسخ شدہ صورت کو مذہب کہتے ہیں۔ اب دیکھئے کہ مذہب کی دنیا میں پہنچ کر، انسانی زندگی کے ان دونوں تقاضوں کے ساتھ کیا ہوا۔؟

مذہب کا تصوّر

مذہب کا بنیادی تصور یہ ہے کہ یہ دنیا قابلِ نفرت ہے۔ یہاں کی ہر شے شر ہے۔ اس لئے خدا پرست انسان کو چاہیئے کہ وہ دنیا سے دور بھاگے۔ یہاں کی ہر شے سے نفرت کرے۔ وہ جس قدر مادی دنیا کے لذائذ و حظائظ سے قطع تعلق کرتا جائے گا،

اتنا ہی خدا کا مقرب بنتا جائے گا۔ حتیٰ کہ اگر اس کی کیفیت یہ ہو جائے کہ ان جاذبیتوں کے لئے اس کے دل میں خواہش تک بھی پیدا نہ ہو، تو اس کی مکمل نجات ہو جائے گی۔ یہ ظاہر ہے کہ جب تک انسان زندہ رہے گا اسے کھانے پینے کی چیزوں کی ضرورت لامحالہ رہے گی۔ اس سے اُسے مفر ہی نہیں۔ وہ انہیں کم کر سکتا ہے۔ لیکن ان کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ وہ جنگل میں چلا جائے۔ غاروں میں جا بسے۔ پہاڑ کی چوٹی پر آسن جما کر بیٹھ جائے۔ اسے کچھ نہ کچھ کھانے پینے کے لئے ضرور چاہیئے۔ اس لئے، مذہب پرست لوگ، کھانے پینے کی چیزوں کو تو مطلق حرام قرار نہ دے سکے، البتہ جن عناصر کا تعلق انسان کے جذبات سے تھا — یعنی اشیائے کائنات کا جمالیاتی پہلو — انہوں نے ان کا گلا ضرور گھونٹ دیا۔ پھر اتنا ہی نہیں کہ یہ لوگ ان چیزوں سے اجتناب کرتے رہے ہوں۔ انہوں نے ایسی زندگی بسر کرنا، تقاضائے "روحانیت" قرار دیا جو ہر صاحب ذوق کے نزدیک انتہائی قابلِ نفرت ہو۔ آپ ان کی روحانی دنیا کے بڑے بڑے اکابر کے حالات پڑھئے۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ نہایت گھناؤنے اور نفرت آگیں ماحول میں زندگی بسر کرتے تھے۔ وہ عیسائیوں کے (SAINTS) ہوں یا ہندوؤں کے سنیاسی۔ وہ بدھوں کے بھکشو ہوں یا ارباب خانقاہیت ان سب کی کیفیت ایسی ہی نظر آئیگی کسی کے متعلق کہا جائیگا کہ اس نے ساری عمر غسل ہی نہیں کیا۔ کسی نے عمر بھر نہ حجامت بنوائی نہ ناخن ترشوائے۔ کسی نے غلاظت کے ڈھیر اور دلدل میں زندگی گذار دی۔ کوئی ساری عمر آسمان کے نیچے بیٹھا رہا۔ کوئی کنوئیں میں لٹکا رہا۔ آپ اب بھی اپنے ہاں کے کسی "اللہ والے سائیں بابا" — یا ان سے بھی اگلی منزل میں پہنچے ہوئے مجذوب کو دیکھئے۔ غلاظت و کثافت کی وجہ سے آپ کا ذوقِ سلیم ان کے قریب تک جانے سے ابا کرے گا۔ لیکن عقیدتمندوں کے ہجوم کو، اسی مزبلہ میں جنت کی ہواؤں کی خوشبو آرہی ہوگی۔ جو لوگ اس تفریط تک نہیں جاتے، ان کی شریعت بھی زیبائش و آرائش کی چیزوں کو حرام قرار دینے میں کسی سے پیچھے نہیں رہتی۔

اِن کے مقربین کی زندگی

اگرچہ مذہب کی دنیا بیشتر انہی لوگوں پر مشتمل ہوتی ہے جن کی نہ ذہنی سطح بلند ہوتی ہے اور نہ ہی جو ذوقِ لطیف سے بہرہ یاب ہوتے ہیں، لیکن ان گھرانوں میں ایسے لوگ بھی پیدا ہو جاتے ہیں جن میں یہ ذوق..... موجود ہوتا ہے۔ وہ اس کی تسکین کے لئے چور دروازے نکال لیتے ہیں۔ مثلاً عیسائیوں کی شریعت اور طریقت، دونوں میں مادی دنیا قابلِ نفرت ہے۔ لیکن آپ روم کے بڑے بڑے عظیم الشان گرجوں کو دیکھئے۔ ان میں آپ کو مصوری اور مجسمہ تراشی کے نادر نمونے ملیں گے۔ جنت نگاہ کے لئے ان کی خانقاہوں میں حسین و جمیل راہبات (NUNS) تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں جگمگاہٹ پیدا کر رہی ہوں گی۔ اور گرجے کی انتہائی نرم و نازک موسیقی ان کیلئے

چور دروازے

فردوس گوش بنے گی۔ یہی کیفیت ہندوؤں کے مندروں اور سنیاسی آشرموں میں نظر آئے گی ـــ مجسمے تصویریں۔ کرشن، رادھا اور گوپیوں کے عشق و محبت کی ہیجان خیز داستانیں۔ اور انہی پر مشتمل ان کا سنگیت۔ رنگ و رامش کے یہ ہنگامے ان کے ہاں بھگوان کی پوجا اور آتما شکتی کے ذرائع ہیں۔ خود ہمارے ہاں تصوف کے بیشتر خانوادوں میں بلند پایہ موسیقی ـــ جس کا جھٹکا قوالی کی شکل میں کیا جاتا ہے ـــ روحانی منازل طے کرنے کی سیڑھیاں قرار دی جاتی ہیں۔ جو اتنی دور تک نہیں جاتے، وہ مزامیر (سازوں) کے بغیر موسیقی پر اکتفا کر لیتے ہیں۔ (گویا ایک ہی آواز جو انسان کے گلے سے نکلے وہ حلال لیکن وہ لوہے کے تار یا بنسری کے چھید سے نکلے تو حرام!) اور ستم بالائے ستم یہ کہ اس قسم کی تفریق کو منسوب کیا جاتا ہے اس ذاتِ اقدس و اعظم کی طرف جس میں حسنِ کائنات کی تمام جلوہ افروزیاں سمٹ کر آ گئی تھیں۔ حتیٰ کہ ہمارا زاہد خشک قرآن کریم کی جس قرأت پر وجد میں آجاتا ہے۔ اس میں بھی موسیقی کی لے، نئے ناشنیدہ کی طرح ارتعاش انگیز ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں حجازی اور مصری، دو قرأتیں زیادہ مقبول اور مروج ہیں۔ ان میں سے ایک بھیرویں میں ہوتی ہے، اور دوسری بھیرویں میں۔ یہ سب اس لئے کہ ـــ بجز اُن لوگوں کے جو اس ذوق سے یکسر محروم ہوں، یعنی وہ انسانی سطح تک پہنچ نہ پائے ہوں ـــ ذوقِ لطیف سینے میں انگڑائی ضرور لے گا۔ اگر آپ اس کی تسکین کا سامان کھلے بندوں نہیں کریں گے، تو وہ اپنے لئے زمین دوز سرنگیں کھود لے گا۔

پری رو تاب مستوری نہ دارند
چوں در بندی ز روزن سر برآرند

یہ زمیں دوز سرنگیں ـــ یعنی ز روزن سر برآوردن ـــ آجکل کی نفسیاتی اصطلاح میں ـــ بدنہادی، یعنی (PERVERSION) کہلاتی ہے۔ جس کا نتیجہ انسانی ذات کی نشوونما کی بجائے اس کی تخنیق و تدفین ہوتا ہے۔ مذہب کی دنیا میں ہوتا ہی یہ ہے۔ وہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر حقائق کا مقابلہ کرنا نہیں سکھاتا۔ وہ کنکھیوں سے دیکھنا سکھاتا ہے۔ وہ بظاہر صبح سے شام تک، جذبات کی مخالفت میں سرگرمِ سخن رہتا ہے۔ لیکن درحقیقت یہ بہانہ ہوتا ہے انہی جذبات کو اپنے سینے میں متلاطم رکھنے اور ان سے ذہنی لذت حاصل کرنے کا۔ اس کی روش عجیب مضحکہ انگیز ہوتی ہے۔ وہ خدا کو عدیم النظیر صانعِ کائنات مانتا اور اس کی عظمت کے سامنے اپنا سر نیاز جھکاتا ہے، لیکن اس صانع کی عظیم صنعت گری، یعنی دنیا اور اس کی زیبائش و آرائش کی چیزوں کو قابلِ نفرت، اور انسان کے جذبات و عواطف کو فنا کر دینے کے لائق قرار دیتا ہے اور اسے اپنی انتہائی خدا پرستی پر محمول کرتا ہے ـــ صانع کی تعریف اور اس کی صنعت کی مذمت، یہ مذہب کی بارگاہ ہی میں ممکن ہے۔ اس کے برعکس دین، نہ دنیا کو قابلِ نفرت قرار دیتا ہے، نہ انسانی جذبات کو فنا کر دینے کے مستحق۔ وہ انسان کی کسی صلاحیت کو

نہ بجائے خویش خیر قرار دیتا ہے۔ نہ شر۔ ان کا استعمال انہیں خیر یا شر بنا دیتا ہے۔ آئیے ہم دیکھیں کہ قرآن کریم اس اجمال کی تفصیل کیا بیان کرتا ہے۔

ہمارے ہاں دو اصطلاحیں مروج ہیں۔ جلال اور جمال۔ جلال میں قوت بھی شامل ہے۔ اور ہر شے کا افادی پہلو بھی، کیونکہ افادی پہلو کا صحیح استعمال، قوت پیدا کرنے کا موجب ہوتا ہے۔ اس کا تعلق انسان کی طبیعی زندگی سے ہے۔ اس کے برعکس، جمال کسی شے کا تحسینی پہلو ہے۔ یعنی اس کی (APPRECIATIVE VALUE) اس کا تعلق انسان کے جذبات سے ہو۔ جیسا کہ میں نے پہلے بیان کیا ہے مذہب

قرآنی تصور

کی دنیا، اشیائے کائنات کے جلالی (یا افادی) پہلو کو تو خدا کی طرف سے قرار دیتی ہے لیکن ان کے جمالیاتی پہلو کو جس کا تعلق انسان کے جذبات سے ہے، شر سمجھتی ہے۔ یہ ثنویت (DUALISM) درحقیقت، مجوسیوں کے ذہن کی پیدا کردہ ہے جن کے ہاں نیکی کا خدا اور ہے (یعنی یزداں) اور برائی کا خدا اور (یعنی اہرمن)۔ قرآن کریم نے آ کر اعلان کیا کہ ثنویت کا یہ تصور یکسر باطل ہے۔ جلال اور جمال، دونوں کا سرچشمہ ایک ہی ہے۔ یعنی خدائے واحد کی ذات۔ لَهُ الْمُلْكُ وَ لَهُ الْحَمْدُ (۶۴/۱)۔ قوت (اقتدار) اور حمد دونوں کا سرچشمہ اسی کی ذات ہے۔ کسی صانع کے نادر شاہکار کو دیکھنے سے، جذبات تحسین و آفرین کا ابھر کر بے ساختہ زبان پر آجانا، حمد کہلاتا ہے۔ قرآن کریم میں، خدا کو بار بار حمید کہا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی حسن آفرینی محض اتفاقی یا ہنگامی نہیں بلکہ اس کا مظاہرہ التزاماً اور دواماً ہوتا رہتا ہے۔

آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز
رہتا ہے آئینہ ابھی دائم نقاب میں

آپ نے غور کیا ہو گا کہ قرآن مجید کی ابتدا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ سے ہوتی ہے۔ (۱/۱)۔ ربوبیت (پرورش اور نشو و نما) سے اگر اشیائے کائنات کا افادی پہلو سامنے آتا ہے تو حمدیت سے ان کا جمالیاتی گوشہ بے نقاب ہوتا ہے۔ اسی لئے اس نے، خدا کی طرف جانے والے راستے کو صراط العزیز الحمید کہا ہے (۱۴/۱)۔ یعنی وہ راستہ جس پر چلنے سے، غلبہ اور قوت بھی حاصل ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ہی زندگی کے نرم و نازک گوشے بھی سنورتے اور نکھرتے چلے جاتے ہیں۔

خدا نے اپنے عمل تخلیق کے متعلق کہا ہے کہ

اَلَّذِیْۤ اَحْسَنَ كُلَّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ (۳۲/۷)

خدا وہ ہے جس نے ہر شے کو حسین ترین انداز میں پیدا کیا ہے۔

خدا کا عملِ تخلیق

حسن نام ہے صحیح صحیح توازن اور تناسب کا۔ جہاں کسی شے کے توازن و تناسب (PROPORTION) میں ذرا سا فرق آیا، اس کا حسن جاتا رہا۔ پیسکال نے ٹھیک کہا تھا کہ اگر قلوپطرہ کی ناک ذرا چپٹی ہوتی تو دنیا کی تاریخ کچھ اور ہوتی۔ خدا نے اپنے عملِ تخلیق کے متعلق بڑی شدومد کے ساتھ کہا ہے کہ تم اس میں کہیں عدم توازن نہیں دیکھو گے۔ کسی شے کو غیر متناسب نہیں پاؤ گے۔ اس کے کہنے کا انداز ملاحظہ کیجئے۔ سورۃ الملک میں ہے مَا تَرٰى فِيْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ۔ تم خدائے رحمٰن کی تخلیق (اشیائے کائنات) میں کہیں کوئی جھول۔ کوئی سلوٹ۔ کوئی شکن نہیں دیکھو گے۔ کہیں عدم تناسب نہیں پاؤ گے۔ فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۙ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ○ طائرِ نگاہ کے پر کھول کر اسے ذرا کائنات کی فضائے بسیط میں اڑن بال کشائی دو اور پھر اس سے پوچھو کہ کیا اسے کہیں کوئی سقم۔ کوئی عیب۔ کوئی شگاف کوئی بدنمائی دکھائی دی ہے۔ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ۔ ایک بار نہیں۔ بار بار نگاہ سے کہو کہ وہ اچھی طرح دیکھے۔ خوب تلاش اور تجسس کرے۔ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ ○ (۶۷/۳-۴)۔ وہ خاسرا ور واماندہ۔ ناکام اور مایوس کاشانۂ چشم میں لوٹ آئے گی۔ نگارخانۂ فطرت میں اسے کہیں کوئی سقم دکھائی نہیں دے گا۔

زیبائشِ ارضی

اب آگے بڑھئے۔ زمین سے انسان کے لئے سامانِ زیست پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے اس کی حیثیت یکسر افادی نظر آتی ہے۔ لیکن خدا کا ارشاد ہے کہ اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا۔ (۱۸/۷)۔ زمین پر جو کچھ بھی ہے اس میں ہم نے زینت و آرائش کا پہلو بھی رکھا ہے۔ دیکھو تو یہ اس قدر رنگا رنگ کے حسین گہنے پہنے کس قدر دلہن بنی نظر آتی ہے؟ ہم نے کارگہِ فطرت کو ایسا حسین و خوش رنگ کیوں بنایا ہے؟ لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (۱۸/۷)۔ تاکہ انسان بھی اپنی ذات میں اعتدال اور توازن پیدا کر کے، اپنے اعمال کو اسی طرح حسین و جمیل بنائے۔ تو یہ اس ارض پر حسن کی گلکاریاں اس امر کی محرک بنتی ہیں کہ انسان خود اپنی ذات، اور اپنے معاشرہ میں حسن پیدا کرے۔ یعنی اس کا توازن نہ بگڑنے دے۔ آپ نے غور نہیں کیا کہ قرآن نے "نیک عملی" کو حسنات (حسنِ عمل) کہہ کر پکارا ہے!

فضا کی آرائش

ہم نے اوپر دیکھا ہے کہ قرآن کریم نے سطحِ ارض پر بچھی ہوئی بساط کی زینت و آرائش کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ اب نگاہ آسمان کی طرف اٹھائیے اور دیکھئے کہ اس مرصع چھت میں آپ کو کس قسم کی میناکاری نظر آتی ہے؟ قرآن اس کی شہادت دیتا ہے کہ چاند سورج۔ ستارے — بڑے بڑے عظیم کرّے ہیں جو فضا کی پہنائیوں میں مصروفِ گردش ہیں۔ لیکن وہ

اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہتا ہے کہ وَ لَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ (۶۷/۵)۔ تم دیکھو کہ جو فضا سطح ارض سے قریب تر ہے اس میں تمہیں کس قدر حسین و جمیل شمعیں فروزاں نظر آتی ہیں۔ چونکہ ہم جانتے تھے کہ تمہیں ہر شب، سونے سے پہلے، آسمان کی طرف دیکھنا ہے، اس لئے ہم نہیں چاہتے تھے کہ تمہاری نگاہ اوپر کو اٹھے تو وہاں بڑے بڑے بھیانک گڑے دکھائی دیں جس سے تمہاری نیند اچاٹ ہو جائے اور تمہارے بچے ڈر کے مارے سہم جائیں۔ ہم نے ایسا انتظام کر دیا کہ یہ بھیانک گڑے تمہیں جگمگاتی قندیلیں نظر آئیں جو تمہارے لئے وجہ نورانیٔ دل و دیدہ ہوں۔ وَ لَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّ زَيَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِيْنَ۔ (۱۵/۱۶)۔ جو آسمانی کے ان عظیم الجثہ گڑوں کو ہم نے دیکھنے والوں کی نگاہوں میں کیسا خوشنما بنا دیا؟

مویشیوں کی دنیا

سورۂ نحل میں، افادی اور جمالیاتی پہلو، بڑے ہی حسین انداز میں سامنے لائے گئے ہیں پہلے کہا۔ وَ الْاَنْعَامَ خَلَقَهَا لَكُمْ فِيْهَا دِفْءٌ وَّ مَنَافِعُ وَ مِنْهَا تَاْكُلُوْنَ (۱۶/۵) تم مویشیوں کو دیکھو۔ ان میں تمہارے لئے کس قدر فائدے کی چیزیں ہیں۔ ان کی اون سے تم گرم لباس بناتے ہو۔ ان کا گوشت تمہارے کھانے کے کام آتا ہے۔ وَ تَحْمِلُ اَثْقَالَكُمْ اِلٰى بَلَدٍ لَّمْ تَكُوْنُوْا بٰلِغِيْهِ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ (۱۶/۷)۔ ان میں جو بار برداری کے کام آتے ہیں وہ تمہارا سامان اٹھا کر دور دراز شہروں میں لے جاتے ہیں۔ اگر تمہیں یہ سامان خود اٹھانا پڑتا تو تم کس مصیبت میں پڑ جاتے؟۔ وَ الْخَيْلَ وَ الْبِغَالَ وَ الْحَمِيْرَ لِتَرْكَبُوْهَا۔ پھر تم گھوڑوں۔ خچروں۔ اور گدھوں کو دیکھو۔ وہ تمہاری سواری کے کام آتے ہیں۔ وَ زِيْنَةً (۱۶/۸)۔ اور بعض ان میں سے تمہارے لئے سامان زینت بھی بنتے ہیں۔

یہاں تک آپ نے دیکھا کہ مویشیوں کے افادی پہلو کو ابھار کر سامنے لایا گیا ہے۔ اور جو کچھ کہا گیا ہے اس باب میں اس سے زیادہ اور کہا بھی کیا جا سکتا ہے؟ زیادہ سے زیادہ یہ کہ ان میں سے بعض کا دودھ بھی پیا جاتا ہے۔ اس کا ذکر بھی قرآن نے دوسری جگہ کر دیا ہے لیکن نہیں! ٹھیریئے اور دیکھئے کہ قرآن کریم ان کے متعلق اور کیا کہتا ہے؟

محاکات

مناظر کشی، شاعری کی جان ہوتی ہے اور مصوری کی روح ـــ ذرا چشم تصور سے دیکھئے کہ یہ الفاظ آپ کے سامنے کس قدر حسین و پر کیف منظر پیش کرتے ہیں کہ ـــ

ریت کے ٹیلے پہ وہ آہو کا بے پروا خرام

یا ـــــ گونجتی ہے جب فضائے دشت میں بانگ رحیل ـــــ اس کے ساتھ ہی ـــــ

آگ بجھی ہوئی اِدھر، ٹوٹی ہوئی طناب اُدھر
کیا خبر اس مقام سے گذرے ہیں کتنے کارواں!

یا ایک طرف ـــــ وہ نمودِ اختر سیماب پا ہنگامِ صبح ـــــ اور دوسری طرف،

وادیٔ کہسار میں غرقِ شفق ہے سحاب
لعلِ بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا آفتاب

ان میں سے ایک ایک منظر حسن کی اک چلتی پھرتی دنیا اپنے جلو میں لئے ہے۔

اب ذرا انہی آیات کی طرف پھر چلئے جن کا تذکرہ اوپر سے چلا آرہا تھا۔ یعنی یہ کہ تمہارے مویشیوں میں کس قدر منفعت بخش چیزیں ہیں۔ یہ سب کچھ گنانے کے بعد کہا کہ ان میں اس کے علاوہ کچھ اور بھی ہے لیکن اس "کچھ اور" کے دیکھنے کے لئے نگہِ نظارہ جو کی ضرورت ہے۔ کہا کہ وَلَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ حِينَ تُرِيحُونَ وَحِينَ تَسْرَحُونَ (۱۶/۶)۔ ذرا چشمِ تصور سے دیکھو کہ ..... علی الصبح، تاروں کی چھاؤں میں، نور کے ترڑکے، جب فضا کی آنکھیں ہنوز نیم خوابیدہ، نیم وا ہوتی ہیں، اور چاروں طرف سکوت کا عالم، اُس وقت جب تم ان مویشیوں کو چوپال سے نکال کر، باہر چراگاہوں کی طرف لے جاتے ہو، تو یہ منظر کس قدر جمال آفریں ہوتا ہے۔ اور پھر شام کے وقت، جب سورج تھک کر، پہاڑ کی اوٹ میں سستانے چلا جاتا ہے۔ فضا پر چاروں طرف دھندلکا چھا جاتا ہے۔ کھیت اداس اور راستے خاموش ہو جاتے ہیں۔ تو اُس وقت جب تم ان مویشیوں کے گلے کو چراگاہوں سے خراماں خراماں بستی کی طرف واپس لاتے ہو، تو یہ سماں بھی کس قدر کیف بار ہوتا ہے وَلَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ حِينَ تُرِيحُونَ وَحِينَ تَسْرَحُونَ (۱۶/۶)۔ تمہاری نگاہیں ان کے افادی دائروں میں محدود ہو کر رہ گئی تھیں۔ لیکن اگر تمہارے سینے میں ہنر کی قاش نہیں، دھڑکنے والا دل ہے، تو تم محسوس کر دگے کہ ان کے اس جمالیاتی پہلو کی کوئی قیمت ہی نہیں۔

آپ نے برادرانِ عزیز! مویشیوں کے اس طرح چراگاہوں کی طرف جانے اور واپس آنے کے مناظر کسی عظیم تر مصور کے نادر شاہکار میں دیکھے ہوں گے اور یا پھر قرآن کریم کے ان چند الفاظ میں۔ ذرا چشمِ تصور سے کام لیجئے اور دیکھئے کہ کیا ان الفاظ کے محاکاتی اعجاز کے سامنے ہر رنگِ جمال آشنا جھک جھک نہیں جاتی؟

اطاعت سے زینت

اب آگے بڑھئے۔ میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ مذاہب کی دنیا میں تصور یہ ہے کہ جس قدر کوئی شخص خدا کی بندگی۔ پوجا پاٹ۔ بھگتی۔ گیان دھیان میں آگے بڑھتا ہے اتنا ہی وہ دنیا اور اس کی زیبائش و آرائش سے دور ہٹتا چلا جاتا ہے۔ گویا خدا کا تقرب اور

دنیاوی زیبائش و آرائش، ایک دوسرے کی نقیض ہیں۔ زاہد کے لئے خشک ہونا ضروری ہے خواہ وہ کسی مذہب کا زاہد ہو۔ زہد کے معنی ہی بے رغبت ہونا ہیں۔ لیکن دیکھئے کہ قرآن کریم کا اس باب میں کیا ارشاد ہے۔ وہ کہتا ہے۔ یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِیْنَتَکُمْ عِنْدَ کُلِّ مَسْجِدٍ (۳۱/۷)۔ اے نوع انسان! یہ تصور غلط ہے کہ اطاعتِ خداوندی کے لئے ترکِ دنیا، ترکِ لذات، ترکِ زیبائش و آرائش ضروری ہے۔ یاد رکھو! دنیاوی زیب و زینت اطاعتِ خداوندی کی راہ میں حائل نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس اس اطاعت سے خود زیب و زینت کے پہلو ابھرتے ہیں کیونکہ اطاعتِ خداوندی کا لازمی نتیجہ اس دنیا میں خوشگواریاں حاصل ہونا ہیں۔ اور اس کے بعد کی زندگی کی خوشگواریاں بھی۔

اور اس کے بعد قرآن کریم نے وہ اعلانِ عظیم کیا ہے جو اس باب میں قولِ فیصل کا حکم رکھتا ہے اور جس سے مذہب کی دنیا میں زلزلہ پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ اعلان یہ ہے کہ

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِیْنَةَ اللّٰهِ الَّتِیْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَ الطَّیِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ؕ قُلْ هِیَ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا خَالِصَةً یَّوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ (۳۲/۷)۔

اے رسول! تم ان مذہب پرستوں سے پوچھو کہ وہ کون ہے جو اُن زیب و زینت کی چیزوں کو اور اشیائے خورد و نوش کو حرام ٹھیراتا ہے جسے اللہ نے اپنے بندوں کے استعمال کے لئے پیدا کیا ہے؟ یہ سامانِ زیب و زینت، اس دنیا کی زندگی میں (خدا کے طبیعی قانون کے مطابق) کافر و مومن ہر ایک کے لئے کھلا ہے۔ جس کا جی چاہے محنت اور ہمت سے اسے حاصل کر لے۔ لیکن اُخروی زندگی میں یہ صرف مومنین کے حصے میں آئے گا۔

آپ نے اندازہ فرمایا کہ کس قدر سخت ہے اس اعلان میں کہ وہ کون ہے جو خدا کی پیدا کردہ اشیائے زیب و زینت کو لوگوں کے لئے حرام قرار دیدے؟ یہ تو خدا کے مقابل کھڑا ہو جانے کے مرادف ہوگا! اس لئے کہ خدا تو ان چیزوں کو لوگوں کے استعمال کے لئے پیدا کرتا ہے اور یہ لوگوں سے کہتے ہیں کہ ان کے قریب نہ جانا۔ ان کا استعمال حرام ہے! یہ خدا کے مقابلہ میں خدا بن جانا نہیں تو اور کیا ہے؟

جنّت کی نعمتیں

خدا نے، اسلام کے مطابق زندگی بسر کرنے کا نتیجہ جنت بتایا ہے۔ اس دنیا میں بھی جنتی معاشرہ اور اس کے بعد کی زندگی میں بھی جنت۔ اس جنت کی جو تفاصیل قرآن کریم میں آئی ہیں ——— اس دنیا میں حقیقی معنوں میں اور اُخروی زندگی میں تمثیلی انداز سے جن کا بیان ہوا ہے۔

ان پر غور کیجیے اور دیکھیے کہ حسن و زیبائش کا کوئی گوشہ بھی ہے جو اس میں نہ آگیا ہو؟ سب سے پہلے حکائی انداز میں اس منظر کو سامنے لائیے جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ آب رواں کے کنارے، سبزۂ نورستہ۔ گھنیرے درختوں کی چھاؤں۔ بہار کا موسم جس میں نہ زیادہ سردی نہ گرمی لَا یَرَوْنَ فِیْهَا شَمْسًا وَّ لَا زَمْهَرِیْرًا ۚ (۷۶/۱۳)۔ دوسری طرف، اعلیٰ درجے کے صوفے حریر و اطلس کے پردے۔ نرم و نازک ریشم کے ملبوسات۔ (۱۸/۳۱)۔ چاندی اور سونے کے برتن۔ بلوریں آبخورے سونے کے کنگن۔ موتیوں کے ہار (۷۶/۱۵-۲۱)، (۲۲/۲۳)۔ مختصراً یہ کہ مَا تَشْتَهِیْهِ الْاَنْفُسُ وَ تَلَذُّ الْاَعْیُنُ (۴۳/۷۱)۔ اس میں ہر وہ شے ہوگی جس کی آرزو انسان کرے اور جس سے نگاہیں لذت یاب ہوں حتیٰ کہ فَهُمْ فِیْ رَوْضَةٍ یُّحْبَرُوْنَ (۳۰/۱۵)۔ سرسبز و شاداب باغات میں نہایت شستہ اور اعلیٰ پایہ کی موسیقی کی محفلیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس لفظ (اَلْحَبْرَةُ) میں حسن و جمال، زیبائی و رعنائی اور انبساط و مسرت کے تمام مظاہر آجاتے ہیں خواہ وہ جنت نگاہ ہوں یا فردوس گوش۔ یہ ہے وہ جنتی معاشرہ جس کا وعدہ اس دنیا میں کیا گیا ہے اور جس کا تمثیلی بیان جنت اُخروی کے سلسلہ میں قرآن کریم کے متعدد مقامات میں آیا ہے۔ آپ سوچیے کہ زیب و زینت کی جن حسین و جمیل اشیاء کو قرآن نے جماعت مومنین کی حسن کارانہ زندگی کا ماحصل بتایا ہو کیا انہی اشیاء کے استعمال کو خدا حرام قرار دے گا؟

یہ تو رہا خدا کی پیدا کردہ اشیائے کائنات کے حسن و جمال سے بہرہ یاب ہونے کا تذکرہ۔ اب یہ دیکھیے کہ

انسان کا مقام

تخلیق حسن میں خود انسان کا کیا مقام ہے۔ اس ضمن میں پہلے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ قرآن کے نقطۂ نگاہ سے خدا اور انسان کا باہمی تعلق کیا ہے؟ ان کا تعلق باہمی رفاقت کا ہے ــــ نبی اکرمؐ کے ارشاد کے مطابق، خدا رفیقِ اعلیٰ ہے، فلہذا، انسان رفیق ادنیٰ۔ لیکن تعلق ان کا بہرحال رفاقت کا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ دنیا میں خدا کا متعین کردہ پروگرام انسان کے ہاتھوں پورا ہونا ہے۔

انسانی دنیا میں ایک چیز ہے تولید (PROCREATION)۔ یعنی افزائش نسل۔ اس میں انسان اور حیوان دونوں برابر ہیں۔ لیکن خدا اس سے بلند ہے۔ دوسری چیز ہے تخلیق (CREATION) اس میں حیوانات کا کوئی حصہ نہیں۔ لیکن خدا اور انسان اس میں دونوں شامل ہیں۔ خدا نے اپنے آپ کو "احسن الخالقین" کہا ہے ــــ یعنی تخلیق کرنے والوں میں سب سے زیادہ حسین تخلیق کرنے والا۔ جب اس نے اپنے آپ کو خالقین میں شمار کیا ہے تو اس سے ظاہر ہے کہ وہ اپنے علاوہ اور خالق

بھی تسلیم کرتا ہے۔ خدا کے بعد، یہ خالق، انسان کے سوا اور کون ہو سکتا ہے! اس سے واضح ہے کہ جو خصوصیت انسان کو حیوان سے متمیز کرتی ہے وہ، عملِ تخلیق ہے۔ اور اس عملِ تخلیق میں انسان اور خدا دونوں شامل ہیں، اس فرق کے ساتھ کہ خدا کا عملِ تخلیق، حسن کا بلند ترین خاکہ رہتا ہے۔ لہٰذا جس انسان میں تخلیق (CREATIVENESS) کی صلاحیت نہیں، وہ حیوانی سطح پر زندگی بسر کرتا ہے۔ انسانی سطح پر وہ پہنچ ہی نہیں پایا۔ اسی لئے اقبال نے کہا تھا کہ

ہر کہ او را لذتِ تخلیق نیست
نزد ما جز کافر و زندیق نیست

اور جوں جوں انسان، اپنے عملِ تخلیق میں حسن پیدا کرتا جائے گا، وہ رفاقت میں خدا سے قریب تر ہوتا جائے گا۔ اور اس قربِ خداوندی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خود انسان کی اپنی ذات میں بھی حسن پیدا ہوتا جائے گا۔ عمل خیر ہے ہی وہی جس سے حسنِ کائنات نکھرتا جائے اور انسان کی اپنی ذات سنورتی جائے۔ حسنِ کائنات میں یہی اضافے ہیں جن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبالؔ نے (انسان اور خدا کے مکالمہ میں) خدا کو مخاطب کرتے ہوئے، انسان کی زبان سے کہلوایا ہے کہ

تو شب آفریدی، چراغ آفریدم — سفال آفریدی! ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی — خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

موسیقی خدا کے پیدا کردہ خام مسالہ کے تخلیقی امتزاج سے انسان کیا کچھ پیدا کرتا ہے، دنیا کی تاریخِ تمدن و تہذیب، اور داستان آرٹ اور سائنس اس کی زندہ شہادت ہے۔ جہاں تک آرٹ، اور آرٹ میں موسیقی کا تعلق ہے، حضرت داؤد (علیہ) کو اس میں بڑا نمایاں مقام حاصل ہے۔ انہوں نے عبرانی موسیقی (دون کی تھی اور مصری اور بابلی مزامیر (سازوں) کو ترقی دے کر نئے نئے آلات ایجاد کئے، جن میں قانون اور بربط خاص طور پر مشہور ہیں۔ زبور ان کا صحیفہ ہے۔ اس میں، ہر باب کے پہلے، یہ ہدایات موجود ہیں، کہ سردارِ مغنی ان آیات کو کس ساز کے ساتھ گائے۔ اس کے آخری باب میں ہے۔

قرنائی پھونکتے ہوئے خدا کی ستائش کرو۔ بین اور بربط چھیڑتے ہوئے اسکی ستائش کرو۔ طبلہ بجاتے ہوئے اور ناچتے ہوئے اس کی ستائش کرو۔ بلند آواز سے جھانجھ بجا کر اس کی ستائش کرو۔ خوش آواز جھانجھ بجا کر اسکی

ستائش کرو۔

(تورات - صفحہ ۶۱۶ - شائع کردہ برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی لاہور ۱۹۲۲ء)

اس میں شبہ نہیں کہ تورات میں بہت کچھ تحریف ہو چکی ہے لیکن ہم موسیقی کے متعلق اس بیان کو اس لئے قابلِ قبول سمجھتے ہیں کہ جب قرآن کریم میں جنّی معاشرے میں موسیقی کی محفلوں کا ذکر ہے تو یہ باور کیا جا سکتا ہے کہ حضرت داؤدؑ نے اس فن کی تہذیب و تزئین کی ہو گی۔ اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ خود ہمارے ہاں کی کتبِ احادیث کی شروح میں مذکور ہے کہ حضرت داؤدؑ باجے کے ساتھ گایا کرتے تھے (مثلاً حافظ ابن حجر عسقلانی کی فتح الباری)۔

مصوّری

حضرت سلیمانؑ کے متعلق خود قرآن کریم میں ہے کہ انہوں نے مختلف علاقوں کے نادرہ کار صناع اپنے ہاں اکٹھے کر رکھے تھے يَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا يَشَآءُ مِنْ مَّحَارِيْبَ وَ تَمَاثِيْلَ.... (۳۴/۱۳)۔ جو حضرت سلیمانؑ کی منشاء کے مطابق، ان کے لئے بڑے بڑے محلات تعمیر کرتے تھے اور ان میں مجسمے تراشتے ..... یا تصاویر بناتے تھے۔ تماثیل، مجسمے اور تصاویر دونوں کے لئے آسکتا ہے۔

آرٹ۔ (یعنی فنونِ لطیفہ) میں چار اصناف ہی بنیادی شمار کی جاتی ہیں ـــ مجسمہ سازی۔ تصویر کشی موسیقی۔ اور شاعری۔ پہلی تین کا ذکر آ گیا ہے۔ شاعری کے متعلق میں ذرا آگے چل کر عرض کروں گا۔ یہاں قرآن کریم کے ایک اہم نکتہ کی وضاحت ضروری ہے۔

اسماء الحسنیٰ

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، حسن نام ہے صحیح صحیح توازن اور تناسب کا۔ جہاں کسی شے کا توازن بگڑا، حسن معدوم ہو گیا۔ اس کے برعکس، اگر مختلف اور باہدگر متضاد عناصر کے امتزاج میں توازن ملحوظ رکھا جائے، تو ان میں بھی حسن پیدا ہو جاتا ہے۔ آپ غور کیجئے کہ جن حقائق کو صفاتِ خداوندی کہہ کر پکارا جاتا ہے، ان میں باہمی تضاد ہے۔ وہ رحیم بھی ہے اور قہار بھی۔ وہ رؤف بھی ہے اور جبار بھی۔ لیکن یہ صفات، خدا کی ذات میں ایسے صحیح توازن اور اعتدال کے ساتھ جمع ہیں، کہ قرآن، ان کے مجموعہ کو اسماء الحسنیٰ سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی وہ صفات، جو بہیئتِ مجموعی، حسین ترین انداز لئے ہوئے ہیں۔

انسان کے اندر بھی متضاد قوتیں اور جذبات، موجود ہیں۔ جس انسان کے اندر ان قوی اور جذبات میں صحیح صحیح توازن پیدا ہو جاتا ہے، اسے متوازن شخصیت (Balanced Personality) کا حامل کہا جاتا ہے۔ ان قوتوں اور جذبات کا اعتدال و توازن کے ساتھ استعمال حسنِ عمل کہلاتا ہے۔ آرٹ میں یہ اعتدال اور توازن، نازک ترین حد تک پہنچا ہوا ہوتا ہے۔ کسی حسین ترین تصویر میں، آنکھ کی سیاہی میں

ایک نقطہ بھر کی کمی یا زیادتی، اسے بدترین شکل میں تبدیل کر دیتی ہے۔ بلند ترین موسیقی میں، کسی سُر میں ذرا سا زیادہ ابھار، راگ کے روپ کو بگاڑ کر رکھ دیتا ہے۔

اعتدال

قرآن کہتا ہے کہ جب خود ان چیزوں میں حسن نام ہے صحیح توازن و اعتدال کا تو ان سے لذت یاب ہونے میں بھی اعتدال و توازن کا قائم رکھنا نہایت ضروری ہے۔ حد اعتدال سے ذرا بھی آگے بڑھے تو یہی حسن، شر میں تبدیل ہو جائے گا۔ دیکھئے جہاں اس نے کہا تھا کہ وہ کون ہے جو خدا کی پیدا کردہ اشیائے زیبائش و آرائش اور حسین و جمیل سامان زیست کو حرام قرار دے۔ تو وہیں یہ بھی کہہ دیا تھا کہ ان سے بہرہ یاب ہو لیکن وَلَا تُسْرِفُوْا۔ حد سے آگے نہ بڑھو۔ (۷/۳۱)۔ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ۔ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کیا جاتا۔ یعنی ان اشیاء سے لذت یاب ہونا خدا کے نزدیک ناپسندیدہ نہیں۔ اس کے نزدیک حد سے بڑھنا ناپسندیدہ ہے۔ اور یہی وہ حقیقت ہے جسے اس نے سورۂ کہف کی اس آیت میں، جسے میں شروع میں درج کر چکا ہوں۔ کہا ہے کہ اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا۔ ہم نے سطح ارض پر بڑی زیب و زینت کی چیزیں پیدا کی ہیں۔ لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (۱۸/۷)۔ تاکہ یہ دیکھا جائے کہ ان میں سے کون اپنے اعمالِ حیات میں توازن و اعتدال قائم رکھتا ہے۔ یہ تو پھر بھی زیب و زینت سے متعلق ہے۔ وہ تو یہاں تک کہتا ہے کہ وَ لِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى۔ فَادْعُوْهُ بِهَا۔ صفاتِ خداوندی اپنے اندر انتہائی حسن و اعتدال لئے ہوئے ہیں۔ انہیں اسی حسن و اعتدال کے ساتھ اپنے سامنے لاؤ اور اپنے اندر اجاگر کرو۔ وَ ذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآئِهٖ (۷/۱۸۰)۔ جو لوگ، ان میں اعتدال قائم نہیں رکھتے بلکہ اس کی کسی ایک صفت کو لے کر افراط کی طرف نکل جاتے ہیں، ان سے کنارہ کش ہو جاؤ۔ جس طرح مثلاً عیسائیوں نے خدا کی صفتِ "رحیمی" میں اس قدر غلو کیا کہ قانونِ مکافاتِ عمل کو یکسر نظر انداز کر دیا۔ اس سے نہ صرف ان کی اپنی ذات کا حسن بگڑ گیا بلکہ انسان کی تمدنی دنیا میں بھی فساد ہی فساد پیدا ہو گیا۔

یہ ہے، برادران عزیز! وہ بنیادی شرط جس کے ساتھ، قرآن کریم جمالیات سے متمتع ہونے کی تاکید کرتا ہے۔ یعنی زندگی کے افادی اور جذباتی گوشوں میں صحیح صحیح تناسب قائم رکھتے ہوئے۔ افادی اور جذباتی گوشوں کی مثال پٹرول اور موبل آئل کی سمجھئے۔ اگر موٹر میں پٹرول ہی پٹرول ہو۔ موبل آئل نہ ہو، تو اس کا انجن خود اپنی حرارت سے پھٹک جاتا ہے۔ اور اگر اس کی پٹرول کی ٹنکی میں بھی موبل آئل ہو — نہیں، اگر موبل آئل ذرا اپنے مقام سے آگے بڑھ کر، پٹرول میں دخل انداز ہو جائے — تو موٹر کے پرزے چیک ہو کر رہ جاتے ہیں۔ یاد رکھئے۔ جمال اور جلال کے صحیح امتزاج ہی سے، زلف کائنات کی مشاطگی ہو سکتی ہے۔ اقبال کے الفاظ میں،

نہ جدا رہے نوا گر تب و تابِ زندگی سے
کہ ہلاکیٔ اُمم ہے یہ طریقِ نے نوازی

بلکہ اور واضح الفاظ میں۔

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن — جو شے کی حقیقت کو نہ سمجھے وہ ہنر کیا
شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو — جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا
بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں — جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

وہ پیمانہ کیا ہے

سوال یہ ہے کہ وہ پیمانہ کیا ہے جس سے یہ ماپا جا سکے کہ ہم نے افادی اور جمالیاتی گوشوں میں صحیح صحیح توازن قائم رکھا ہے ان کے اعتدال کو بگڑنے نہیں دیا۔ ظاہر ہے کہ اسے افراد کے اپنے اپنے فیصلے پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ جس طرح، مختلف علوم کے ہر شعبے اور فن کے ہر گوشے کے لئے کچھ بنیادی اصول اور معیار ہیں، اسی طرح، افادیت اور جمالیات میں توازن قائم رکھنے کے لئے بھی بنیادی اصول و معیار ہیں۔ یہ اصول وہ ہیں جنہیں قرآن کریم حدود اللہ کہہ کر پکارتا ہے۔ یعنی خدا کی باندھی ہوئی حدیں۔ اور یہ معیار وہ ہیں جنہیں مستقل اقدار کہا جاتا ہے۔ یعنی خدا کے مقرر کئے ہوئے پیمانے جن میں کبھی تغیر و تبدل نہیں ہوتا۔ لا تبدیل لکلمت اللہ۔ ان حدود کے اندر رہتے ہوئے، ان پیمانوں کے مطابق، ان سے ہنر یا ہو جئے تو یہ عین مطابق اسلام ہوگا۔ ان حدود کو پھاند جائیے اور ان پیمانوں کو توڑ دیجئے تو یہ حرام ہو جائیگا۔ یہ حدود فراموش اور پیمانہ شکن ہیں وہ فنکار جن کے متعلق اقبالؒ نے کہا ہے کہ

وہ نغمہ سردیٔ خونِ غزل سرا کی دلیل — کہ جس کو سن کے ترا چہرہ تابناک نہیں
نوا کو کرتا ہے موجِ نفس سے زہر آلود — وہ نے نواز کہ جس کا ضمیر پاک نہیں

یہ حدیں اور پیمانے قرآن کے اندر محفوظ ہیں جو اس خدا کی کتاب ہے جو کائنات کے افادی اور جمالیاتی گوشوں کا خالق اور انسانی ممکنات کی نشو و نما کے تقاضوں سے باخبر ہے۔

اب آئیے شاعری کی طرف۔ قرآن کریم میں نبی اکرمؐ کے متعلق ہے۔ وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ (۳۶/۶۹)۔ ہم نے اسے شاعری نہیں سکھائی۔ حقیقت یہ ہے کہ شاعری ایک پیغامبر کے شایانِ شان ہی نہیں ہوتی۔ اس سے بظاہر یہ نظر آتا ہے کہ قرآن کریم شاعری کو پسند نہیں کرتا۔ لیکن یہ نکتہ ذرا تشریح طلب ہے۔

سب سے پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ قرآن کریم نے جب شاعری کی مذمت کی ہے تو اس سے یہ مراد نہیں کہ

اس کے نزدیک نثر میں بیان کردہ مفہوم قابل قبول ہے اور اسی مفہوم کو اگر نظم میں بیان کر دیا جائے تو وہ مذموم اور مردود قرار پا جائے گا۔ قرآن، اسلوبِ بیان سے بحث نہیں کرتا۔ مقصود بیان سے بحث کرتا ہے۔ شاعری سے اس کی مراد وہ جذبات پرستی ہے جس کا حقائق سے کچھ واسطہ نہیں ہوتا۔ اور قرآن، زندگی کے حقائق سے بحث کرتا ہے۔ چنانچہ جس آیت کو ہم نے ابھی ابھی پیش کیا ہے اور جس میں کہا گیا ہے کہ ہم نے رسول کو شاعری نہیں سکھائی۔ اور نہ ہی شاعری، ایک رسول کے شایانِ شان ہے تو اس سے آگے ہے اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّ قُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ (۳۶/۶۹)۔ جو کچھ ہم نے رسول کو دیا ہے وہ تاریخی شواہد اور زندگی کے بنیادی اصول اور واضح قوانین ہیں۔ اور اس سے مقصد یہ ہے لِيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا (۳۶/۷۰) کہ جن لوگوں میں زندہ رہنے کی صلاحیت اور آرزو ہے یہ انہیں، اس کے ذریعے، زندگی کی غلط روش کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کر سکے۔ قرآن کریم تاریخی شواہد اور زندگی کے ٹھوس حقائق سے بحث کرتا ہے اور شاعری، اس کے خلاف، جذبات سے کھیلتی ہے۔ رسول کے سامنے، زندگی کا ایک متعین نصب العین ہوتا ہے اور اس کا

رسول کی حیثیت

ہر قدم اس نصب العین کی طرف اٹھتا ہے۔ نہ مشکلات و مصائب اس کے لئے سنگِ راہ بنتی ہیں، اور نہ ہی مفاد پرستانہ جاذبیتیں، اس کی دامنگیر ہو کر حصولِ مقصد کی راہ میں حائل ہوتی ہیں۔ گوئٹے کے الفاظ میں اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

در راہِ او بہار پری خانہ آفرید — نرگس دمید و لالہ دمید و سمن دمید
گل عشوہ داد و گفت یکے پیش ما بایست — خندید غنچہ و سرِ دامانِ او کشید
ناآشنائے جلوہ فروشانِ سبز پوش — صحرا برید و سینۂ کوہ و کمر درید

زی بحرِ بیکرانہ چہ مستانہ می رود
در خود یگانہ، از ہمہ بیگانہ می رود

رسول کی یہ کیفیت زندگی کی جانفزا وادیوں میں ہوتی ہے۔ جہاں تک جلال کا تعلق ہے اس کا عالم یہ ہوتا ہے کہ

دریائے پر خروش زبند و شکن گذشت — از تنگنائے وادی و کوہ و دمن گذشت
یکساں چو سیل کردہ نشیب و فراز را — از کاخِ شاہ و بارہ و کشت و چمن گذشت
بیتاب و تند و تیز و جگر سوز و بے قرار — در ہر زماں بتازہ رسید از کہن گذشت

زی بحرِ بیکرانہ چہ مستانہ می رود
در خود یگانہ از ہمہ بیگانہ می رود

یہ کیفیت ہے مصاحبِ زندگی میں ایک رسول کی جو عالمگیر انقلاب کا داعی ہوتا ہے۔ اس کے برعکس شعراء کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے کہ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِیْ كُلِّ وَادٍ یَّهِیْمُوْنَ ۙ (۲۶/۲۲۵)۔ کیا تم دیکھتے نہیں کہ وہ کس طرح، اَلْهِیْم کی طرح، مختلف وادیوں اور بیابانوں میں مارے مارے پھرتے ہیں اَلْهُیَام اس اونٹ کو کہتے ہیں جسے جھوٹی پیاس کی بیماری لگ جائے اور وہ اسے مختلف چراگاہوں اور نخلستانوں میں لئے لئے پھرے لیکن کسی جگہ اس کی تشنگی دور نہ ہو۔ شاعر کے سامنے چونکہ زندگی کا متعین نصب العین نہیں ہوتا، اس لئے وہ کبھی جذبات کی اِن وادیوں میں پھرتا ہے اور کبھی تخیلات کی اُن جولانگاہوں میں۔ اور چونکہ یہ جذبات بھی جھوٹے ہوتے ہیں اس لئے اس کی کہیں تسکین ہی نہیں ہوتی۔ وہ ساری عمر یونہی بھٹکتا پھرتا ہے۔ وَ یَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ اور اس کے پیچھے لگنے والے بھی بھٹکتے پھرتے ہیں، لیکن شاعر کو اس سے دھوکا لگ جاتا ہے کہ اس کے متبعین کی جماعت بہت بڑی ہے۔ حالانکہ یہ جماعت نہیں بلکہ ایک انبوہ کثیر ہوتا ہے جس کی حالت ٹڈی دل کی سی ہوتی ہے۔ (الغادی۔ ٹڈی دل کو کہتے ہیں)۔ دیکھنے میں لاکھوں لیکن بغیر کسی نصب العین کے۔ ان سب کا آخری نتیجہ تباہی اور بربادی ہوتا ہے۔ پھر، ان شاعروں کی اپنی زندگی کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ اَنَّهُمْ یَقُوْلُوْنَ مَا لَا یَفْعَلُوْنَ۔ وہ ایسی باتیں کہتے ہیں جنہیں خود کر کے نہیں دکھاتے۔ اس لئے کہ جب پیاس ہی جھوٹی ہو تو قول اور عمل میں موافقت کیسے ہو؟

اس سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم کے نزدیک، شاعری پیرایۂ بیان کا نام نہیں۔ یہ ایک خاص ذہنیت کا نام ہے جو اُس ذہنیت کی یکسر نقیض ہوتی ہے جسے قرآن پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اسی لئے اس نے شاعروں کی اس ذہنیت کا ذکر کرنے کے بعد کہا ہے اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ۔ ان کے برعکس وحی کی صداقتوں پر ایمان رکھنے والوں کی ذہنیت ہے جو ایک متعین نصب العین پر یقین رکھتے ہیں۔ اور ایسے پروگرام پر عمل پیرا رہتے ہیں جو ان کی اپنی ذات کی صلاحیتوں کی بھی نشوونما کرے۔ اور دنیا کے بگڑے ہوئے کام بھی سنوارے۔ وَّ انْتَصَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا۔ جب ان پر کوئی ظلم اور زیادتی کرے تو وہ سودا کی طرح "غنچے" کو آواز نہیں دیتے کہ "ذرا لانا تو میرا قلمدان ہجو لکھ کر اسے مزہ چکھا دوں۔" وہ اُس سے اُس زیادتی کا بدلہ لیتے ہیں وَ سَیَعْلَمُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْۤا اَیَّ مُنْقَلَبٍ یَّنْقَلِبُوْنَ (۲۶/۲۲۷)۔ اور ایک ایسا نظام قائم کرتے ہیں جس میں ظلم اور زیادتی کرنے والے بدلگام نہ پھرتے رہیں کہ جو ان کے جی میں آئے کریں۔ انہیں کوئی روکنے ٹوکنے والا ہی نہ ہو۔ اس نظام میں اس قسم کے لوگوں کو صاف نظر آجاتا ہے کہ انہیں ان کی غلط روش سے ہٹا کر کس مقام کی طرف لایا جائے گا اور ان کا ٹھکانہ

کونسا ہوگا۔

یہ ہے فرق شاعرانہ ذہنیت اور مومنانہ ذہنیت میں۔ قرآن کریم نے اس شاعرانہ ذہنیت کی مذمت کی ہے، نہ کہ شعر کی مذمت۔ کالرج نے جب کہا تھا کہ شاعری کی ضد (ANTI - THESIS) نثر نہیں بلکہ سائنس ہے، تو اس سے اس نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا تھا۔

اس مقام پر ایک اور نکتہ کی وضاحت بھی ضروری ہے۔ دیگر اقوام عالم (مثلاً یونان وغیرہ) کی

شاعری اور نبوت

طرح، عربوں کے ہاں بھی یہ عقیدہ تھا کہ (کاہنوں اور نجومیوں کی طرح) شاعر کو بھی الہام ہوتا ہے۔ اس لئے وہ نبوت کو بھی از قبیل شاعری ہی سمجھتے تھے۔ وہ رسول اللہ کو کبھی ساحر، کبھی کاہن اور کبھی شاعر کہتے تھے۔ قرآن کریم نے اس عقیدہ کی بھی تردید کی اور کہا کہ نبوت، شاعری نہیں۔ شاعروں کا بافت اور سروش، ان کے اپنے تخیلات کی تخلیق ہے۔ اس کے برعکس، وحیٔ نبوت ایک خارجی حقیقت ہے جو نبی کے اپنے جذبات، تخیلات یا وجدان کی پیداکردہ نہیں ہوتی۔ قرآن کریم جب شاعروں کی مذمت کرتا ہے تو اس سے اس کا مقصد اس عقیدہ کی تردید بھی ہوتا ہے۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ (مصوری اور موسیقی کی طرح) قرآن کریم شعر کی مذمت نہیں کرتا۔ وہ دیکھتا یہ ہے کہ شاعر کہتا کیا ہے؟ اس باب میں اس کا معیار یہ ہے کہ

سینہ روشن ہو تو ہے سوزِ سخن عینِ حیات
ہو نہ روشن تو سخن مرگِ دوام اے ساقی

اور سینے کو روشنی، خدا کی عطا کردہ مستقل اقدار کی قندیل ہی سے مل سکتی ہے۔ جب سینہ اس شمع نورانی سے روشن ہو، تو پھر شاعر کے سامنے زندگی کی تمام شاہراہیں جگمگاتی چلی جاتی ہیں اور وہ جنت سے نکلے ہوئے آدم کو پھر سے جنت کی طرف لے جانے والا راستہ دکھاتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جس کے متعلق اقبالؒ نے کہا تھا کہ

شعر را مقصود اگر آدم گری است
شاعری ہم وارثِ پیغمبری است

یہ وہ شاعری ہے جو دلوں کی دنیا میں انقلاب پیدا کر کے، ہر دور کے فرعونوں، ہامانوں اور قارونوں کا تختہ اُلٹ کر رکھ دیتی ہے۔

صد نالۂ شبگیرے۔ صد صبح بلاخیزے   صد آہ شرر ریزے۔ یک شعرِ دلآویزے

اس کے برعکس، غلامانہ ذہنیت کی آفریدہ شاعری ہے جس میں کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

می چکد از خامہ ہا مضمونِ موت
ہر کجا افسانہ و افسونِ موت

یہ وہ شاعری ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ

رہزنِ قلب است و ابلیسِ نظر

اس میں خود شاعر کی نازک مزاجی کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ

غنچہ چٹکا تو کہا سر میں دھمک ہوتی ہے

اقبالؒ کے الفاظ میں۔۔۔

از نزاکت ہائے طبعِ مہشگافِ او مپرس — گز دمِ بادے ز جاجِ شاعرِ ما بشکند
کے تواند گفت شرحِ کارزارِ زندگی — می پرورنگش حبابے گرد بر پا بشکند

قرآن کا پیغام، حیات کا پیغام ہے۔ انقلاب کا پیغام ہے۔ غلط نظامِ زندگی کی ہر بساط کو الٹ کر اس کی جگہ صحیح نظامِ زندگی متشکل کرنے کا پیغام ہے۔ یہ انسانی ذات کے نکھرنے اور حسنِ کائنات کے نکھارنے کا پیغام ہے۔ یہ خود سنور کر دنیا کے ہر بگاڑ کو سنوارنے کا پیغام ہے۔ یہ حیوانی سطح زندگی پر جینے والوں کو مقامِ آدمیت سے متعارف کرانے، اور آدم کو انسانیت کی سطح پر لیجانے کا پیغام ہے۔ یہ پیغام ہے انسان کو اس بلند مقام سے متعارف کرانے کا جہاں، وہ (نیٹشے کے الفاظ میں) اپنے مقدر کے ستاروں کو جھک کر دیکھے۔ نغمہ ہو یا شعر۔ رنگ ہو یا چنگ، اگر وہ اس پیغامِ حیات آور کا نقیب ہے، تو وہ حلال ہی نہیں، واجب ہے۔ اور اگر وہ جیتے جاگتے انسان کو موت کا پیغام دیتا ہے، تو اس کے حرام ہونے میں کوئی کلام نہیں۔ یہ وہ آرٹ ہے جس کے متعلق اقبالؒ نے کہا ہے کہ

تو ہے میت، یہ ہنر تیرے جنازے کا امام
نظر آئی جسے مرقد میں شبستانِ حیات

آرٹ وہی حیات بخش ہو سکتا ہے جس میں جلال اور جمال کا صحیح امتزاج ہو۔ اگر یہ نہیں تو اس کی حیثیت برگِ حشیش سے زیادہ کچھ نہیں۔

دلبری بے قاہری جادوگری است
دلبری با قاہری پیغمبری است

یہ ہے، عزیزانِ من! میری بصیرت کے مطابق قرآن کریم کی رو سے آرٹ کی حیثیت۔

عناصر اس کے ہیں روح القدس کا ذوقِ جمال
عجم کا حسن طبیعت عرب کا سوزِ دروں

اگر بایں نرسیدی تمام بولہبی است —— بہو گرمادینے والی موسیقی کے اثرات کا اندازہ تو ہم کبھارت کے ساتھ اپنی گزشتہ جنگ میں کر چکے ہیں۔ ۶ ستمبر کی صبح لاہور پر ہندوؤں کے اچانک حملہ سے فضا میں جو اضطرابی کیفیت پیدا ہو گئی تھی شام کو جب ریڈیو سے —— ساتھیو! مجاہدو!! جاگ اٹھا ہے سارا وطن —— کی فلک شگاف آواز، پورے دبدبہ اور طنطنہ کے ساتھ سکوت شکن ہوئی ہے تو اس نے ہوا کا رخ بدل دیا۔ اس سے دلوں میں نئے ولولے بیدار ہو گئے اور ہمتیں بلند سے بلند تر ہوتی چلی گئیں۔ اس کے بعد مسلسل سترہ دن تک، ملی ترانوں نے فضا میں جو ارتعاش پیدا کر رکھا تھا اس کے اثرات کی داستانیں ان سپاہیوں سے سنئیے جن کے لئے یہ آوازیں، زندگی اور حرارت کا ہزار سامان اپنے جلو میں لئے، فردوس گوش بنی تھیں۔ یہ ترانے، الفاظ و حروف کی شکل میں آج بھی ہمارے سامنے ہیں لیکن اب یہ الفاظ بے جان سے نظر آتے ہیں ان میں زندگی کی برق تپاں، حسنِ نغمہ کی رہینِ منت تھی۔ اور ابھی یہ ہمارا پہلا تجربہ تھا۔ اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اگر پیغامِ حیات افروز کے ساتھ، مغنی آتش نفس کی نشید جلال انگیز بھی شامل ہو جائے تو یہ کس قدر وجہ فروغِ جذبات ہو سکتے ہیں۔ اور جب ان جذبات سے، وحی کی روشنی میں کام لیا جائے تو شہپر انسانیت کس طرح "بال و پر روح الامیں" پیدا کر لیتا ہے —— میں اسے پھر دہرا دوں کہ فطرت کی طرف سے انسان کو جس قدر صلاحیتیں عطا ہوئی ہیں وہ بجائے خویش نہ خیر ہیں نہ شر۔ ان کا استعمال انہیں خیر یا شر بنا دیتا ہے۔ اگر ان صلاحیتوں کو خدا کی عطا مستقل اقدار کے تابع رکھا جائے تو اس کا نتیجہ خیر ہی خیر ہوتا ہے —— خواہ وہ شعر و سخن کے حسین پیکر میں ہوں یا رنگ و چنگ کے حریری لباس میں —— انسانی صلاحیتیں!

لادیں ہوں تو ہیں زہر ہلاہل سے بھی بڑھ کر
ہوں دیں کی حفاظت میں تو ہر زہر کا تریاک

والسلام

اِدارۂ طلوعِ اسلام کی بصیرت افروز مطبوعات

(۱) **انسان نے کیا سوچا؟** افلاطون اعظم سے لے کر اب تک گزشتہ ساڑھے تین ہزار سالوں میں فکرِ انسانی کن مراحل میں بھٹکتی ہوئی کہاں سے کہاں تک پہنچی ۔ مفکرینِ عالم کی ہزاروں کتابوں کا لب لباب ۔ قیمت ۱۲ روپے

(۲) **اسلام کیا ہے؟** اسلام کے درخشندہ حقائق کا حقیقت کشا مرقع ۔ مفکرِ قرآن کی بصیرتِ قرآنی کا بصیرت آفریں شاہکار ۔ قیمت ۔ اعلیٰ ایڈیشن آٹھ روپے ۔ سستا ایڈیشن ۔ چار روپے

(۳) **من و یزداں** ۔ خدا کیا ہے؟ اسے ماننا کیوں ضروری ہے؟ نہ ماننے سے کیا ہوتا ہے اور ماننے سے کیا کچھ حاصل ہوتا ہے؟ ذہن انسانی میں ابھرتے ہوئے ان بنیادی سوالات کا جواب قرآنِ کریم کی روشنی میں ۔ قیمت دس روپے

(۴) **ابلیس و آدم** ۔ آدم ۔ ملائکہ ۔ وحی ۔ ابلیس ، شیطان ۔ جن ۔ ان سب کی حقیقت قرآن کریم کی رو سے کیا ہے؟ یہ حقائق اسی کتاب کے مطالعہ سے سامنے آسکتے ہیں ۔ قیمت ۔ آٹھ روپے

(۵) **سلیم کے نام خطوط** ۔ (تین جلدوں میں) ہماری نئی نسل کے ذہنوں کو کس قسم کے سوالات طلسم پیچ و تاب بنائے ہوئے ہیں اور فکرِ قرآنی کس حسین انداز سے انہیں روشنی میں لاکر شادابیٔ قلب و نگاہ کا سامان پیدا کرتی ہے ۔ اسے علیٰ وجہ البصیرت سمجھنے کے لئے ان کا مطالعہ ضروری ہے ۔ قیمت ۔ جلد اوّل ۔ آٹھ روپے ۔ جلد دوم و سوم چھ چھ روپے ۔

(۶) **سلسبیل** :۔ پرویز صاحب کے علم افروز مقالات اور حقیقت کشا خطابات و نشریات کا مجموعہ ۔ قیمت ۸ روپے

(۷) **بہارِ نو** ۔ انہیں مقالات اور خطابات کا دوسرا مجموعہ ۔ سستا ایڈیشن ۔ قیمت ۵ روپے

(۸) **اسبابِ زوالِ اُمت** ۔ عروج و اقبال کے مقاماتِ بلند سے محروم ہو کر ہم زوال اور شکست کی موجودہ پستی تک کیوں پہنچے؟ اس اہم اور تاریخی سوال کا جواب قرآنِ کریم کی بارگاہِ عالی سے ۔ قیمت ۔ ڈیڑھ روپیہ ۔

(۹) **اسلامی معاشرت** :۔ روزمرہ کی زندگی کے اہم مسائل کی تفصیل قرآنی تعلیمات کی روشنی میں ۔ قیمت دو روپے ۔

اسی سلسلہ بصیرت افروز کی مزید کڑیاں :۔ مقامِ حدیث ۔ چار روپے ، برقِ طور ۔ چھ روپے ، شعلۂ مستور چھ روپے

لغات القرآن ۔ جلد اول ۔ دوم ۔ سوم ۔ پندرہ پندرہ روپے میں ۔ جلد چہارم ۔ بارہ روپے ۔ مکمل سیٹ پچاس روپے ۔

فجر الاسلام ۔ آٹھ روپے ۔ الفتنۃ الکبریٰ ۔ چھ روپے

شائع کردہ

ادارہ طلوعِ اسلام ۔ ۲۵/بی ۔ گلبرگ ۲ لاہور

رابطۂ باہمی

بزم لاہور

رسالہ طلوع اسلام کی نشر و اشاعت کے سلسلہ میں بزم نے جو اہم ذمہ داری اپنے سر لے رکھی ہے اس سے عہدہ برا ہونے کے لئے اراکین بزم بڑی گرمجوشی سے کام کر رہے ہیں۔ پرویز صاحب کے ہفتہ واری درس قرآن مجید کا انتظام بطریق احسن سرانجام پا رہا ہے۔ بزم کے احباب بڑھتے ہوئے کام کے سلسلہ میں ادارہ کا ہاتھ بڑی خوش اسلوبی سے بٹا رہے ہیں۔ ۳۰ جولائی کو جشن عید میلاد النبیؐ حسب روایات سابقہ ۲۵۔ بی گلبرگ میں بڑے تزک و احتشام سے منایا گیا۔

بزم کراچی

سندھ اسمبلی ہال میں ہفتہ واری درس کا اہتمام بڑی عمدگی سے سرانجام پا رہا ہے۔ درس کی مقبولیت دن بدن بڑھ رہی ہے۔ طلوع اسلام کی نشر و اشاعت کی ذمہ داری حسن خلوص سے پوری کی جا رہی ہے ۱۰ جولائی کو جشن عید میلاد النبیؐ جوش عقیدت کے ساتھ منایا گیا۔ بزم کے ایک اجلاس میں رفیق محترم محمد انور (مرحوم) کارڈ روڈ کی وفات پر اظہار تعزیت کر کے ادارہ سے درخواست کی گئی کہ بزم کے ان غم آلود جذبات کو مرحوم کے پسماندگان تک پہنچا دیا جائے۔

بزم سرگودہا

رسالہ کی نشر و اشاعت کا کام بڑی خوش اسلوبی سے سرانجام پا رہا ہے۔ ٹیپ ریکارڈر کے ذریعے پرویز صاحب کے درس قرآن مجید کا سلسلہ شروع کر دیا گیا ہے جو دن بدن مقبول ہو رہا ہے۔ نئے احباب سے رابطہ پیدا کیا جا رہا ہے جس کا نتیجہ بڑا حوصلہ افزا ہے۔

بزموں کی توجہ کیلئے

اکثر بزموں کی طرف سے کاروائی کی رپورٹ موصول نہیں ہو رہی۔ اس کی طرف خصوصی توجہ کی ضرورت ہے ویسے بزمیں جس تندہی اور جانفشانی سے نشر و اشاعت کے سلسلہ میں گرم جوش ہیں اس کا ادارہ کو احساس ہے اور وہ ان سب کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہے لیکن

قدم بڑھا — یہ مقام انتہائے راہ نہیں!

ناظم ادارۂ طلوع اسلام

کچھ کتابوں کی بابت

(۱) ادارہ طلوع اسلام کی طرف سے شائع شدہ کتابوں نے ملک کے تعلیم یافتہ طبقہ کے قلب و دماغ میں صحیح قرآنی انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ یہی ہمارے لٹریچر سے مقصود ہے۔

(۲) طلوع اسلام ایک مشنری ادارہ ہے اور اس کی قرآنی تحریک کے قیام اور فروغ کا دارومدار بیشتر انہی کتابوں کی آمدنی پر ہے اس لئے اس باب میں آپکا تعاون خود اس تحریک کی تائید کا موجب بھی ہوگا۔

(۳) کتابوں کا اشتہار آپ کو رسالہ کے مختلف مقامات پر ملیگا۔ نیز رسالہ کے اندر ایک کارڈ چسپاں ہوگا جس میں ان کتابوں کی فہرست درج ہوگی اس سے آپ کتابوں کا انتخاب کر سکتے ہیں۔

(۴) کتابوں کی فرمائش بھیجتے وقت ضروری ہے کہ آپ فرمائش کی مجموعی قیمت کا کم از کم دسواں حصہ بذریعہ منی آرڈر بھیجدیں۔ بقایا کا وی۔ پی آپ کے نام بھیجدیا جائے گا۔

(۵) کتابوں پر ڈاک کا خرچ بہت بڑھ جاتا ہے۔ اگر آپ اس خرچ کی بچت چاہتے ہیں تو اس کے لئے آپ ہمارے "پیشگی خریداروں کے حلقہ میں شامل ہو جایئے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ آپ سو روپے کی رقم (یکمشت یا چار اقساط میں) پیشگی جمع کرا دیں۔ اس کے بعد جو کتاب آپ طلب فرمائینگے آپکو بھیجدی جائے گی اور اس پر ڈاک کا خرچ ہم خود برداشت کریں گے۔ آپ کا حساب ہمارے ہاں باقاعدہ رہے گا اور زرِ پیشگی کے ختم ہونے پر (یا ساتھ کے ساتھ) آپ اس میں مزید پیسے جمع کرا دیجئے۔

(۶) دستی کتابیں ادارہ سے (دفتر کے اوقات میں) مل سکتی ہیں۔

(۷) احتیاط کے باوجود حساب میں بعض اوقات غلطی ہو سکتی ہے اس لئے حساب فہمی میں ضبط و تحمل سے کام لینا چاہیئے۔ دانستہ بدمعاملگی اس ادارہ میں کبھی نہیں ہوگی۔

والسلام - (ناظم)

خریداروں سے

(۱) آپ کا چندہ بذریعہ منی آرڈر وصول ہو یا وی۔ پی کے ذریعے۔ یا اسے آپ دستی ادا کریں بہر حال میں ادارہ کی طرف سے ایک چھپی ہوئی رسید جاری ہوگی جس پر آپ کا نمبر خریداری دیا جائے گا اور یہ بھی تصریح ہوگی کہ چندہ کی میعاد کب سے کب تک ہے۔

(۲) جس ماہ آپ کا چندہ ختم ہوگا اس ماہ کے رسالہ میں ایک کارڈ منسلک ہوگا جسمیں اس امر کی اطلاع دی جائے گی۔ اس کے جواب میں آپ کا چندہ موصول ہونے پر آپکا رسالہ جاری رہ سکے گا ورنہ بند کر دیا جائیگا۔

(ویسے) اس اطلاعی کارڈ کے بغیر بھی آپ کو علم ہوگا کہ آپ کا چندہ کس ماہ میں ختم ہو رہا ہے اسلئے رسالہ جاری رکھنے کے لئے چندہ کی ترسیل آپ کا فریضہ ہوگا۔

(۳) رسالہ ہر ماہ کے شروع میں ٹھیک ٹھیک چیک کر کے حوالہ ڈاک کیا جاتا ہے اگر آپ کو رسالہ نہ ملے تو اس کی اطلاع اس ماہ کی پندرہ تاریخ تک دیں۔ اسکے بعد اطلاع ملنے کیصورت میں رسالہ بشرط موجودگی قیمتاً بھیجا جا سکے گا۔

(۴) پتہ کی تبدیلی کی اطلاع بیس تاریخ تک مل جانی چاہیئے اگر یہ اطلاع نہ ملیگی تو پرچہ سابقہ پتہ پر بھیجا جائیگا۔

(۵) اکثر پرچے ڈاک میں گم ہو جاتے ہیں اس لئے آپ اپنے ہاں کے مقامی ڈاکخانے کو بھی تاکید کر دیں کہ آپ کا پرچہ آپ تک پہنچا دیا کرے۔ یہاں سے پرچہ چیک کر کے بھیجا جاتا ہے۔

(۶) احتیاط کے باوجود حساب میں بعض اوقات غلطی ہو سکتی ہے۔ اس لئے حساب فہمی کے سلسلہ میں ضبط اور تحمل سے کام لینا اچھا ہوتا ہے۔ اس ادارہ میں دانستہ بدمعاملگی کبھی نہیں ہوگی۔

(۷) آپ کا تعاون ہر حال میں ہمارے لئے شکریہ کا موجب ہوگا۔ والسلام۔ (ناظم ادارہ)

چند اہم کتابیں

(۱) **اسبابِ زوالِ اُمّت:** یہ سمجھنے کے لئے کہ حقیقی اسلام کیا تھا اور اسکے بعد اس پر کیا گزری۔ یہ کتاب بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ قیمت۔ ایک روپیہ ۵۰ پیسے۔

(۲) **مقامِ حدیث:** یہ الزام آپ نے اکثر سنا ہوگا کہ طلوع اسلام "منکر حدیث" ہے لیکن اس کی تفصیل شائد آپ کو معلوم نہیں ہوگی کہ احادیث کی صحیح پوزیشن کیا ہے یہ کس طرح مرتب ہوئیں اور کس طرح ہم تک پہنچیں۔ انکے اقرار اور انکار سے مراد کیا ہے، علم حدیث کے موضوع پر یہ کتاب بڑی جامع ہے۔ قیمت ۱۲ روپے

اسلامی معاشرت: روزمرہ کی زندگی کے متعلق قرآن کے احکام کیا ہیں؛ انہیں بچوں، عورتوں کم تعلیم یافتہ لوگوں کے لئے نہایت سادہ زبان میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ قیمت ۱۰ روپے

بہارِ نَو ۔ پرویز صاحب کے انقلاب آفریں، بصیرت افروز، دلکش مضامین کا تازہ ترین مجموعہ۔ قیمت ۵ روپے

طاہرہ کے نام خطوط: عورتوں کی زندگی سے متعلق ہدایات اور احکام خطوط کی شکل میں۔ انداز دلکش بیان سادہ، مضامین پُرمغز، راہ نمائی قرآنی ـــ قیمت حصہ اول دو روپے حصہ دوم اڑھائی روپے۔

ان کتابوں پر محصول ڈاک الگ ہوگا لیکن اگر آپ پیشگی خریداروں کی فہرست میں شامل ہیں تو پھر آپکو محصول ڈاک نہیں دینا پڑے گا۔ (اسکی تفصیل پچھلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیے۔) (ناظم)

وہ کتابیں جن سے اسلام کا صحیح تصور سامنے آجاتا ہے

لغات القرآن — قرآن کریم کے تمام الفاظ کا مستند، واضح اور تحقیقی مفہوم جس سے قرآنی تعلیم بحر کر سامنے آجاتی ہے۔ یہ قرآن کی ڈکشنری نہیں بلکہ انداز میں اس کی تفسیر ہے۔ پہلی تین جلدوں کی قیمت۔ پندرہ روپے فی جلد۔ چوتھی جلد کی قیمت۔ بارہ روپے **مکمل سیٹ** کی رعایتی قیمت پچاس روپے۔

اسلام کیا ہے؟ — دین کے بنیادی تصورات کا نہایت حسین اور دل کش مرقع۔ قسم اعلیٰ (آٹھ روپے) چھپا ایڈیشن (چار روپے)۔

قرآنی فیصلے — زندگی کے مختلف مسائل اور معاشرہ کے معاملات کے متعلق قرآن کیا کہتا ہے۔ بڑی معلومات افزا کتاب ہے جلد اوّل (تین روپے پچیس پیسے) جلد دوم (تین روپے پچیس پیسے) جلد سوم (تین روپے)۔

سلیم کے نام خطوط — ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے دل میں اسلام کے متعلق طرح طرح کے سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ ان سوالات کا نہایت سادہ اور دل کش خطوط کے انداز میں جواب۔ مذہب گزیدہ نوجوانوں کو اسلام کی طرف لانے کے لئے بڑی کامیاب کوشش ہے۔

جلد اوّل (آٹھ روپے) جلد دوم (چھ روپے) جلد سوم (چھ روپے)۔

انسان نے کیا سوچا؟ — افلاطون سے لیکر اس وقت تک کے مختلف مفکرین۔ مورخین اور سائنسدانوں نے زندگی کے مسائل کے متعلق کیا کہا ہے۔ کیا وہ انسانی دنیا کی گتھیاں سلجھا سکے ہیں؟ یہ کتاب آپ کو سینکڑوں کتابوں سے بے نیاز کر دے گی۔ قیمت۔ بارہ روپے

نظام ربوبیت — انسانی زندگی کا پہلا مسئلہ روٹی کپڑے کا ہے۔ کیا یورپ یا روس کا نظام اس مسئلہ کا اطمینان بخش حل پیش کر سکا ہے؟ قرآن اس کا کیا حل پیش کرتا ہے۔ معاشی دنیا کی انقلاب آفریں کتاب ہے۔ (چار روپے)

ابلیس و آدم — آدم۔ ملائکہ۔ ابلیس۔ شیطان۔ جنات۔ وحی۔ نبوت کے متعلق قرآنی تصورات۔ (آٹھ روپے)

من و یزداں — خدا کیا ہے۔ انسان کیا ہے۔ ان دونوں کا تعلق کیا ہے۔ تقدیر کسے کہتے ہیں۔ دعا کا مفہوم کیا ہے۔ (دس روپے)

برق طور — صاحب ضرب کلیمؑ اور فرعون کی آویزش۔ بنی اسرائیل کے عروج و زوال کی داستان' جو یوں کہئے کہ خود ہماری داستان ہے۔ (چھ روپے)

شعلۂ مستور — حضرت عیسیٰؑ کی بصیرت افروز داستانِ حیات۔ کیا آپ بن باپ کے پیدا ہوئے تھے؟ کیا آپ ابھی تک زندہ ہیں؟ کیا آپ دوبارہ تشریف لائیں گے؟ (چھ روپے)۔

سلسبیل — پرویز صاحب کے خطابات اور مقالات کا فکر انگیز مجموعہ۔ (آٹھ روپے)

فجر الاسلام
ضحی الاسلام

مصر کے نامور مورخ علامہ احمد امین (مرحوم) کی معرکہ آراء تصانیف کا اردو ترجمہ۔ زمانہ قبل از اسلام سے لیکر شباب اسلام تک کی تحقیقاتی داستان۔ ان کتابوں نے عالم اسلام میں بڑی شہرت حاصل کی ہے۔

(فجر الاسلام (آٹھ روپے) ضحی الاسلام (پانچ روپے)

الفتنۃ الکبریٰ — مصر کے شہرۂ آفاق (نابینا) مورخ ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی شہرۂ آفاق کتاب کا اردو ترجمہ۔ عہد حضرت عثمانؓ کے خونچکاں مرقع کا پس منظر اور اس کے اسباب۔ ان واقعات کا ذمہ دار کون تھا؟ (چھ روپے)۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام۔ ۲۵/بی۔ گلبرگ۔ لاہور

پرویز صاحب کی عمر بھر کی قرآنی فکر کا ماحصل

انقلاب انگیز کتابیں

انسان نے کیا سوچا؟

کیا تنہا عقل انسانی زندگی کے مسائل کا حل دریافت کر سکتی ہے؟ اس اہم اور پیچیدہ سوال کا جواب یونان کے فلاسفروں سے لے کر ہمارے زمانے کے مفکرین اور سائنسدانوں نے کیا دیا ہے؟ یہ کتاب آپ کو سینکڑوں کتابوں سے مستغنی کر دے گی۔ بڑی تقطیع خوبصورت ٹائپ۔ عمدہ سفید کاغذ مجلد بارہ روپے

سلیم کے نام خطوط

ہمارا تعلیم یافتہ نوجوان طبقہ ایک عجیب کشمکش میں گرفتار ہے اسلام کے متعلق اسکے دل میں سینکڑوں شکوک و شبہات پیدا ہوتے ہیں لیکن اسے ان کا کہیں سے اطمینان بخش جواب نہیں ملتا۔ جب وہ اس طرح مذہب سے متنفر ہو جاتا ہے تو ہم اسے کوسنے لگ جاتے ہیں۔ اسے کوسئے نہیں۔ یہ کتاب دیجئے اور پھر دیکھئے کہ وہ کس طرح صحیح اسلام کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ خطوط کا انداز بڑا دلکش اور ہلکا پھلکا ہے۔ خوبصورت ٹائپ۔ عمدہ کاغذ۔ مجلد پہلی جلد آٹھ روپے دوسری و تیسری جلد (آٹھ روپے فی جلد)

لغات القرآن

یہ قرآنی الفاظ کی صرف ڈکشنری نہیں۔ یہ ان کا مستند اور واضح مفہوم پیش کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتاتی ہے کہ ان الفاظ سے قرآن کس قسم کا تصور پیش کرتا ہے۔ اس کی تعلیم کیا ہے۔ اس کی دعوت کیا ہے۔ قرآن نے انسان کو کیا دیا ہے۔ یہ اس کا مقام کیا متعین کرتا ہے۔ چار جلدوں کی یہ کتاب قرآنی حقائق اور علوم حاضرہ کا انسائیکلوپیڈیا ہے۔ خوبصورت ٹائپ۔ عمدہ سفید کاغذ۔ خوبصورت جلد۔ پہلی تین جلدوں کی قیمت پندرہ روپے فی جلد۔ چوتھی جلد بارہ روپے۔ مکمل سیٹ ستاون روپے ہیں۔

عہد آفریں کتابیں

بصیرت افروز کتابیں

سلسبیل

پرویز صاحب کے خطبات اور مقالات نے ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ کے دل و دماغ میں عجیب خوشگوار انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ سلسبیل انہی خطبات و مقالات کا دلکش مجموعہ ہے جس میں زندگی کے مختلف گوشے ابھر کر سامنے آ گئے ہیں۔ ایسی کتابیں عہد آفریں ہوتی ہیں۔ کتابت طباعت کاغذ عمدہ۔ قیمت مجلد آٹھ روپے

اسلام کیا ہے

یہ مسائل کی کتاب نہیں۔ یہ آپ کو بتائے گی کہ اسلام کے بنیادی تصورات کیا ہیں۔ وہ کس قسم کا معاشرتی، معاشی، سیاسی نظام قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس کی رو سے انسانی پیدائش کا مقصد کیا ہے اور اسکی غرض و غایت کیا۔ اور معاشرہ میں عورت کا صحیح مقام کیا ہے۔ (قسم اعلیٰ ـ آٹھ روپے جیبی ایڈیشن ـ چار روپے)

معلومات افزا کتابیں

ناظم ادارہ طلوع اسلام ـــ ۲۵ / بی ـ گلبرگ ـ لاہور